McGill University Library
3 103 124 795 A

This is a reproduction of a book from the McGill University Library collection.

Title: Ḥujjatulllāh al-Bālighah
Author: Walī Allāh al-Dihlawī, 1702 or 3-1762 or 3
Publisher, year: Lāhūr : Maktabat Baytulḥikmat, [1950]

The pages were digitized as they were. The original book may have contained pages with poor print. Marks, notations, and other marginalia present in the original volume may also appear. For wider or heavier books, a slight curvature to the text on the inside of pages may be noticeable.

ISBN of reproduction: 978-1-926846-49-1

This reproduction is intended for personal use only, and may not be reproduced, re-published, or re-distributed commercially. For further information on permission regarding the use of this reproduction contact McGill University Library.

McGill University Library
www.mcgill.ca/library

من شوکت علی ابن شیرازی

TETE

ISLAMIC STUDIES LIBRARY

یادداشت

صـ ۲۷۹، سطر ۱۳ اور اس سے آگے کی عبارت یوں پڑھیں :-

خلاصہ یہ کہ (اس دوسری حالت میں اعمال کی تاثیر ایسی ہوتی ہے) جیسے منتروں اور تعویذوں کی جو بزرگوں سے منقول چلے آتے ہیں۔ (وہ جس شکل و حالت میں بتائے جاتے ہیں، اسی طرح کرنے سے تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ اگر ... رح کو دیکھ کر ان کی شکل و ہیئت میں تبدیلی کر دی جائے، تو وہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اعمال روحانی کیفیتوں سے علیحدہ ہو کر اپنی تاثیر دکھاتے ہیں) باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

صـ ۲۹۴، سطر ۲، اور سطر ۳ کی پوری عبارت یہ ہے :-

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس شخص کے عملوں کے نتیجے، جو اس کے نفس کے ساتھ ملحق ہو چکے ہوتے ہیں، صلاح (بھلائی) یا فساد (برائی) میں تبدیل ... ہے جاتے ہیں اور اس کی عملی زندگی میں ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں، جن سے اسے راحت یا تکلیف پہنچتی ہے۔ (یعنی اسے تکلیف دینے والے اسباب جمع ہو چکے تھے، لیکن بعض وجوہات سے ملاءِ اعلیٰ کا فیصلہ اس کے متعلق اچھا ہوتا ہے، تو ملاءِ اعلیٰ کی ہمت سے

سے اِن تکلیف دہ اسباب میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، جس سے وہی چیزیں راحت کا سامان بن جاتی ہیں۔ یا اس شخص کے لیے راحت کے سامان موجود تھے، لیکن کسی وجہ سے ملاءِ اعلیٰ میں اس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے، تو اس کے اثر سے وہ راحت کے سامان اس کی تکلیف کا سبب بن جاتے ہیں] صاف صاف بات تو یہ کہ . . . .

اعتذار

"شرح حجۃ اللہ البالغہ" اواخر سنہ ۱۹۴۶ء میں پریس میں چلی گئی تھی، لیکن اوائل سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ محشر خیز فسادات شروع ہو گئے، جن کی تلخ یاد اب تک باقی ہے۔ اِن حالات میں اس کی کاپیوں وغیرہ کی تصحیح و اصلاح پر قابو نہ رہا۔ اس لیے بعض مقامات پر افسوسناک غلطیاں رہ گئی ہیں، ان کی تصحیح درج ذیل کی جاتی ہے۔ مطالعے سے پہلے ان اغلاط کی اصلاح کر لی جائے ۔

(مرتّب)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۵	حاشیہ ۱	پیدائش سنہ وفات سنہ	پیدائش سنہ ۵۶۰ھ / ۱۱۶۴ء وفات سنہ ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء
″	حاشیہ ۲	ہندی ہندی	محمد محمد (مراد محمودی)
۷۸	۳	اِنسان	اِنسانِ اکبر
″	۶	بھی	یہی
۸۱	۱۵	سے	نے
۸۵	۳	نوع	جنس
″	″	جنس اور جنس	نوع اور نوع

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۷	۱۶	اُن کو	اُنھیں
۹۵	۷	کرتے	لاتے
۹۷	۳	آجاتی ہے	آجاتا ہے
〃 ۹۸	۱۸ ۱	ایک محقق کو ایک واسطے کا ماننا ضروری ہے۔	ایک محقق کو عالم مثال کا جاننا ضروری ہے، جو ایک مستقل عالم ہے
۹۸	۱۱	واسطے	عالَم
۱۴۰	۱۰	نئیٔ	روز نئیٔ
۱۴۱	۵	سمجھ لے گا)	سمجھ لے گا (یعنی
۱۴۳	۹	گویا	اِس طرح کہنے کی جو مخالفت کی گئی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ
۱۴۸	۴	"اِنسان اکبر"	انسان
۱۸۳	۱	دیبے	دیے
۱۸۹	۱۸	وہ	یہ
〃	〃	جو	کہ
۱۹۰	۳	نکالنا	نکالتا
۱۹۲	۴	ہئے	ہے)
〃	۵	ہو)	ہو
۱۹۵	۱۷	اندازمے	اندازسے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۵	۱۸	———	ہونی چاہئیں +
۱۹۸	۴	(عرش	عرش
〃	۱۱	اِن آیات	چنانچہ ان آیات میں اسی طرف اشارہ ہے۔
۲۰۵	۷	کوئی ذرہ قوانین کے	کوئی ذرّہ اِن قوانین کے اثر سے باہر نہیں۔ ان قوانین میں سے
۲۰۵	۸	سب	سب سے مؤثّر قانون ہے۔ چنانچہ
〃	۹	اپنی	اپنی طرف کھینچتا
۲۰۷	حاشیہ سطر ۳	نواسی	نُوری
۲۱۰	۳	———	(مُرتّب)
۲۱۲	۵	وہ	×
۲۲۱	۶	کو	کو جو
۱۲۳	۱	ہے۔	ہے۔ جو اس کے احاطے میں ممکن ہو۔
۲۲۷	۳	اور	کو اور
۲۴۷	۸	ہے	ہے)
۲۴۹	۷	+	+ (اس مزاج کو متغیّر مزاج کہا جائے گا)
۲۵۱	۸	ہے	ہے (
۲۶۴	۲	کے	کیے
۲۶۶	۳	محسوس	اختیار

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶۷	۱	اس	اس کے تمام نتائج
۲۷۵	۱۱ تا ۱۴	ہاں کسی شخص نے ...... نہیں کرے گا۔	ہاں کسی شخص نے اپنی روحانی کیفیتوں کو بہت بڑھا لیا ہو، تو وہ اعمال کے بغیر خُلق کا تصور کر سکتا ہے۔ لیکن یہ صُورتیں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے قانون ان پر توجہ نہیں کرتا۔
۲۷۷	۳	ہیں۔	اعمال اس کے لیے دوسرے درجے پر ہوں گے۔
۲۸۴	۱۸	ٹکر	ٹکڑے
۲۹۲	۴	باتیں جاگتے ہیں	باتیں خارجی اسباب جمع ہو جانے سے جاگتے ہیں
۲۹۳	۵	کام کیے ہیں)	کام کیے ہیں دنیا میں)
〃	۱۳	کرتے ہیں	کرتے ہیں۔ یعنی بظاہر خود بخود خوش ہونے کو جی چاہتا ہے یا مرض کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔
۲۹۷	۳	جو اس	جو اس کی جزا
۲۹۷	۴	رہتا ہے۔	رہتا ہے (کیونکہ دنیا میں علت و معلول کا سلسلہ جاری رہنا سنّت اللہ ہے۔ جیسے ایک بدمست حاکم کو سزا ملنی چاہیئے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
			لیکن اس امر کے پیشِ نظر کہ اسے سزا ملنے سے معاشرہ انسانی میں خلل نہ پڑ جائے، اس کی سزا وقتی طور پر ملتوی کر دی جاتی ہے)
۳۱۳	۱۷	اختیار	امتیاز
۳۲۷	۳	نوعی صورت	صورت
"	۹	ہوگا]	ہوگا۔ یہ اس کی روح کہی جاتی ہے]
۳۲۸	۱۰	اخلاق	قوتوں
۳۳۱	۱۰	پیشے	پیشے والے
۳۳۲	۱۳	صورتوں	صورت
۳۳۳	۴	اندر	جو ہر ہیں
۳۴۶	۵	ایسی	ایسی مادی
"	"	جو باتوں	جو ان آثار
۳۵۹	۲	خاص	خارجی
۳۶۶	۱-۲	کے بدلوں	کی روحوں
۳۶۸	۸	اِستعمال کیا	حکم دیا
۳۸۲	۲	القرس	القدس
	۶	مواد	معاون

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (القرآن)

(اور جسے حکمت دی گئی ہے، اُسے بہت بڑی بھلائی دی گئی ہے۔)

اردو شرح

حجۃ اللہ البالغہ

(مصنفہ امام الائمہ امام ولی اللہ دہلویؒ)

از

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل

مرتبہ

شیخ بشیر احمد بی۔اے، لودیانوی

مکتبہ بیت الحکمۃ لاہور

قیمت: چار روپے

جملہ حقوق بحقِ بیت الحکمت، لاہور
محفوظ ہیں۔

C6
V1766
S6162
25104

مولوی خدا بخش مہتمم مکتبۂ بیت الحکمۃ لاہور

نے

گیلانی برقی پریس، لاہور میں

باہتمام

مسٹر ضمیر احمد خان پرنٹر طبع کرا کر

مکتبۂ بیت الحکمت، لاہور

سے

شائع کیا

سنہ ۱۳۶۹ھ

مطابق

سنہ ۱۹۵۰ء

فہرست مضامین

اُردو شرح حجۃ اللہ البالغہ

دیباچہ (از مصنفؒ) ۵

مقدمہ ۲۴

پہلا حصّہ ۶۹

پہلا مبحث: انسانی ذمّہ داری اور انسان کے عملوں کی جزا کے اسباب ۶۹

پہلا باب: اِبداع، خلق اور تدبیر کی تشریح ۷۱

دوسرا باب: عالمِ مثال ۹۳

تیسرا باب: مَلاءِ اعلیٰ ۱۰۹

چوتھا باب: اللہ تعالیٰ کا قانون یا سنّت اللہ ۱۳۵

پانچواں باب: روح کی حقیقت ۱۴۵

چھٹا باب: انسان کے لیے قانون کی پابندی کی ضرورت ۱۵۷

ساتواں باب: انسانی ذمّہ داری کی پیدائش اُس کی تقدیر سے ۱۶۹

آٹھواں باب: شرعی قانون جزا اور سزا کے لیے کیوں لازم ہے ۲۰۳

نواں باب: انسانی سوسائٹی میں جبلّی اختلافات ۲۲۵

دسواں باب: انسان کے دل میں "خواطر" کی پیدائش ۲۴۳
گیارھواں باب: انسانی درجے سے اعمال کا علاقہ ۲۵۳
بارھواں باب: اعمال کا تعلق نفسی حالتوں کے ساتھ ۲۶۹
تیرھواں باب: کرموں کا پھل کیوں ملتا ہے؟ ۲۸۱
دوسرا مبحث: انسان کے عملوں کی جزا اس زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں ۲۹۹
چودھواں باب: دنیا میں انسان کے عملوں کی جزا ۳۰۱
پندرھواں باب: انسان کی موت کی حقیقت ۳۱۹
سولھواں باب: برزخ ۳۳۹
سترھواں باب: حشر کے واقعات ۳۷۱

اِعتراف

مَن لَّم یَشکُرِ النَّاسَ لَم یَشکُرِ اللہَ

آئندہ اوراق میں حُجَّۃُ اللہِ البَالِغَۃ (مصنّفہ حجۃ اللہ علی الارض امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ) کی جو شرح دی گئی ہے، وہ حضرت مولانا عُبیداللہ سندھی (نوّر اللہ مرقدہٗ) سے مولانا عبداللہ صاحب لغاری احمدانی (نزیل میرپور خاص سندھ) نے ۱۳۵۳ھ میں مکہ مکرمہ میں اخذ کی اور انھوں نے اپنا مسودہ بیت الحکمت لاہور کو نقل کرنے کے لیے عنایت فرمایا۔ چنانچہ یہ مطبوعہ نسخہ اسی مسودے سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے لیے کارکنانِ بیت الحکمۃ، لاہور، مولانا لغاری (متّعنا اللہ بطولِ حیاتہٖ) کے بہت ہی ممنون ہیں۔

مولانا عبداللہ ولد نہال فقیر ولد محمد خان احمدانی ثم لغاری ۱۲۹۲ھ میں سندھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۶ھ میں حضرت مولانا سندھی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے بعد عُسر و یُسر میں ان کے ساتھ رہے اور کابل کے سفر میں بھی ان کے ہمرکاب تھے۔ آپ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی قدرے استفادہ کیا اور مولانا سندھی رحمہ اللہ سے اُن کے مدرسہ دارالرشاد ضلع حیدرآباد واقع درگاہ حضرت پیر صاحب العَلَم میں بہت عرصہ

اور مکہ مکرمہ میں تین سال کے قریب رہ کر قرآنِ حکیم کی مکمل تفسیر کا املاء لیا، جس کا مبیضہ انھوں نے "المقامُ المحمود" کے نام سے ۱۳۵۳ھ میں مکہ مکرمہ ہی میں مرتب کیا اور کئی بار "حجۃ اللہ" پڑھی اور "العقبات" (مصنفہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ) اور "خیر کثیر" (مصنفہ امام ولی اللہ دہلویؒ) کا بھی درس لیا۔

مولانا ممدوح نے نہایت ہی مہربانی سے اپنی مرتب کردہ تفسیر "المقام المحمود" سے بھی بیت الحکمۃ، لاہور کو استفادے کا موقع دیا۔ چنانچہ جن سورتوں کی تفسیر اب تک مکتبۂ بیتُ الحکمۃ، لاہور کی طرف سے شائع ہوچکی ہے[1]۔ ان میں "المقام المحمود" سے بھی بعض مضامین لیے گئے ہیں[2]، جن کے لیے بیت الحکمۃ (لاہور) مولانا موصوف کا بے حد ممنون ہے۔

---

[1] یعنی، (۱) قرآنی دستورِ انقلاب (تفسیر سورۂ مزمل و سورہ مدثر)، (۲) جنگِ انقلاب (تفسیر سورۂ قتال) اور (۳) عنوانِ انقلاب (تفسیر سورۂ فتح)۔ (مرتّب)

[2] "المقام المحمود" کے علاوہ اِن سورتوں کی ترتیب و تدوین میں روسی فاضل مولانا موسیٰ جار اللہؒ کی تفسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جو انھوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے اخذ کی۔ (مرتّب)

ضروری اطلاع

اگلے صفحوں میں جو کچھ دیا گیا ہے، وہ "حجۃ اللہ البالغہ" مصنّفہ حجۃ الاسلام امام ولی اللہ دہلویؒ کا لفظی ترجمہ نہیں ہے، بلکہ مولانا عُبَیداللہ سندھیؒ کا کیا ہوا سلیس ترجمہ اور تشریح ہے، جسے آسان اُردو میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کی اصلی رُوح کو کسی حال سے بھی صدمہ نہیں پہنچنے دیا گیا +

ضروری اطلاع

اگلے صفحوں میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ حُجّۃ اللہِ البالغہ مصنفہ حجۃ الاسلام امام ولی اللہ دہلویؒ کا لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا کیا ہُوا سلیس ترجمہ اور تشریح ہے جسے آسان ہندستانی میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کی اصلی رُوح کو کسی حال سے بھی صدمہ نہیں پہنچنے دیا گیا +

(مرتّب)

دیباچہ

از

مصنفؒ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام شیخ بشیر احمد
پرنٹر و پبلشر چھپکر مکتبہ بیت الحکمت لاہور سے شائع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ

حدیث کا علم | اسلام میں حدیث کا علم دینی[1] علموں کی بنیاد ہے۔ اور یقینی[2] علموں میں بہت اونچے درجے کا شمار ہوتا ہے۔ اس علم میں اُن کاموں کا ذکر ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اللہ کی رحمتیں اور سلامتیاں اُن پر ہوں) نے خود کیے یا کسی اور نے آپؐ کے سامنے کیے اور آپؐ نے اُن کے کرنے سے روکا نہیں یا اُن باتوں کا بیان ہوتا ہے جو حضورؐ نے فرمائیں۔ آپؐ کے یہ حالات اندھیرے میں چراغ کی مانند ہیں اور

---

[1] وہ علم جن کا تعلق مذہب اور دین کے ساتھ ہے +

[2] وہ عام علم جیسے ریاضی، سائنس، تاریخ اور دینی علم وغیرہ جن کے پڑھنے سے انسان کو پورا پورا یقین حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کی باتوں میں کوئی شک نہیں رہتا +

25104

راہ چلنے والوں کے لئے راستے کے نشانات ہیں بلکہ چودھویں کا چاند ہیں جس کی روشنی میں کوئی مسافر راستہ نہیں بھول سکتا۔ جو شخص آنحضرت صلعم کے کاموں اور باتوں کو سمجھ لے اور یاد کرلے وہ سیدھا راستہ پا لیتا ہے اور زندگی کی مشکلات دُور کر کے اِس دُنیا اور مرنے کے بعد کی زندگی میں جس کامیابی کی ضرورت ہے اُس کے متعلق پوری پوری دانائی اور حکمت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص دانائی اور عقل کی ان باتوں سے منھ پھیر لیتا ہے۔ وہ بے شمار غلطیوں میں پھنس جاتا ہے اور اوپر چڑھنے کے بجائے نیچے کو گرتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ضرور نقصان اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم کی زندگی کے اُن حالات میں جو حدیثوں میں آئے ہیں بُرے کاموں سے روکا گیا ہے، اچھے کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بُرے کام کرنے سے جو بُرے نتیجے نکلتے ہیں اُن سے ڈرایا گیا ہے اور اچھے کام کرنے سے جو اچھے نتیجے حاصل ہوتے ہیں، اُن کی خوش خبری دی گئی ہے۔ آپؐ نے کبھی تو صاف صاف طور پر سمجھایا ہے کبھی اپنی بات مثالوں کے ذریعے سے بتائی ہے غرض ہر طرح سے لوگوں کو خُدا کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپؐ کی حدیثوں میں یہ سب کچھ ہے۔ یہ خُدا کے کلام یعنی قرآن شریف کی مانند ہے یا اُس سے کچھ زیادہ[۵] ہے۔

---

[۵] حاشیہ اگلے صفحہ پر

حدیث کے علموں کے درجے | حدیثوں کے متعلق مسلمانوں نے جو علم ایجاد کیے وہ کئی طرح کے ہیں۔ اگر اصل حدیثوں کو ہم مغز اور گودا خیال کریں تو کہا

حاشیہ صفحہ ۶ ؎ جو جو باتیں اوپر بیان ہوئی ہیں وہ سب حدیثوں میں موجود تو ہیں لیکن ان باتوں کی جڑ قرآن حکیم میں ہے۔ اس لحاظ سے حدیثوں کی یہ باتیں قرآن کی باتوں کے "برابر" ہیں کیونکہ وہی ہیں۔ مثلاً اگر قرآن میں آیا ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کے حکم کی فرمانبرداری کرنا انسانیت کے خلاف ہے تو حدیث میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے اس طرح حدیثوں میں قرآن حکیم کی بین الاقوامی روح (Spirit of Internationalism) اچھی طرح محفوظ کر لی گئی ہے +

قرآن حکیم وہ باتیں بیان کرتا ہے جو انسانیت کی بنیاد اور جڑ ہیں۔ ان میں عربی قوم کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لیکن چونکہ قرآن کی تعلیم تمام قوموں کو سمجھانے کے لئے عربوں سے کام لیا جانا تھا اس لئے ضروری تھا کہ قرآن حکیم کی باتوں کو ان کی عقل اور ذہنیت کے مطابق سمجھ کر ان کے لئے قرآن کے بین الاقوامی قانون میں سے ایک قومی قانون بنا لیا جاتا۔ حدیثوں میں اس قومی قانون ہی کا ذکر ہے اس لحاظ سے بھی وہ قرآن حکیم کے برابر ہیں +

ایک طرح سے حدیثیں قرآن حکیم کی تعلیم سمجھانے کی مشکلیں دور کرتی ہیں اس لحاظ سے وہ قرآن حکیم سے بھی زیادہ فائدہ پہنچانے والی ہیں۔ چونکہ عرب کے لوگ آگے چل کر غیر عربی قوموں میں قرآن حکیم کی تعلیم پہنچانے والے تھے اس لئے ان کی ذہنیت کا شروع ہی سے مطالعہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ انہوں نے کس طرح اسلامی علموں میں درجہ بدرجہ ترقی کی، اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے +

یہ جملہ کہ "حدیث قرآن کے برابر ہے یا اس سے زیادہ" آنحضرتؐ کا فرمایا ہوا جملہ ہے جو یہ ظاہر کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کو کھول کر بیان کرنے کے لئے اور قرآن حکیم کی تعلیم کی ترقی کی رفتار معلوم کرنے میں حدیثوں کی کتنی ضرورت ہے +

جاسکتا ہے کہ اُن کے اوپر بہت سے چھلکے اور پوست ہیں۔ یہ حدیثوں کے متعلق مختلف علم ہیں۔ یا اگر اصل حدیثوں کو موتی کہا جائے تو ان علموں کو بہت سے سیپ کہا جاسکتا ہے جو اس موتی کے اوپر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہمارے علماء نے (اللہ ان پر طرح طرح کی رحمتیں برسائے) حدیث کے علم کی مشکلیں دُور کرکے اسے آسان بنانے کے لئے طرح طرح کی کتابیں لکھی ہیں جن میں حدیث کے گودے پر چڑھے ہوئے چھلکوں اور پردوں کو اُتارا گیا ہے۔

سب سے پہلا چھلکا یعنی درجہ جو سب سے اوپر اور ظاہر کے قریب ہے وُہ وہ علم ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ یہ حدیث کیسی ہے؟ صحیح[1] ہے، ضعیف[2] ہے، مشہور[3] ہے، یا غریب[4] ہے۔ حدیثوں کے اس طرح جانچنے کا کام پہلے زمانے کے محدثین (حدیثوں کو جاننے اور جانچنے والوں) کے بڑے بڑے

---

[1] حدیث کے علم کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہوتی ہے جس میں روایت بیان کرنیوالا کوشش کرکے زیادہ سے زیادہ الفاظ بیان کرتا ہے جو آنحضرت صلعم نے بیان فرمائے۔

[2] ضعیف روایت وہ ہوتی ہے جس کے الفاظ ہم تک پوری طرح صحیح طور پر نہ پہنچے ہوں مثلاً اس وجہ سے کہ روایت بیان کرنے والوں کا حافظہ اچھا نہیں یا کوئی اور وجہ ہو۔

[3] وہ روایت جو ہم تک دو سے زیادہ راویوں یعنی بیان کرنے والوں کی زبان سے پہنچی ہو۔

[4] وہ روایت جو صرف ایک ہی راوی یعنی بیان کرنے والے کی زبان سے ہم تک پہنچی ہے یعنی صرف ایک راوی ہے جس نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے یوں فرمایا ہے۔

اماموں اور حدیث کے حافظوں نے جنھوں نے حدیثوں کو زبانی حفظ کر رکھا تھا بڑی محنت سے پورا کیا ہے۔

حدیث کے علم کا دوسرا۲ درجہ وہ ہے جس میں کسی حدیث کے ان لفظوں کی تحقیق لغت (ڈکشنری) کی رُو سے بیان کی جاتی ہے جن کا استعمال روزمرہ میں کم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے معنی سمجھنے میں دقّت ہوتی ہے یا ایسے لفظوں کا بیان ہوتا ہے جو لکھنے میں تو ایک طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ لیکن زبر زیر وغیرہ کے فرق سے اُن کے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ عربی ادب کے بڑے بڑے عالموں نے بڑی کوشش کر کے اس علم کو بھی انتہا کو پہنچا دیا ہے۔

اس کے بعد تیسرا۳ درجہ آتا ہے۔ اس میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ اس حدیث میں کونسا قانون بتایا گیا ہے۔ اور اس سے ہم اپنی روزمرّہ کی عملی زندگی کے لئے کیا قاعدہ یا قاعدے نکال سکتے ہیں یعنی کسی حدیث میں خاص لفظوں میں جو حکم دیے گئے ہیں اُن سے ضرورت کے وقت اَور حکم نکالنا۔ اسے قیاس کہتے ہیں۔ اور جہاں کہیں حدیثوں میں اشارے یا کنایے سے بات کہی گئی ہے وہاں دلیل پیش کر کے نیا حکم نکالنا۔ کہیں کہیں حدیثوں میں ایسے حکم بھی ملتے ہیں جو خاص حالتوں میں دیے گئے تھے تو پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا یعنی واپس لے لیا گیا۔ ایسے حکموں کو اُن حکموں سے الگ کرنا جو ہمیشہ کے لئے ہیں اس کا بیان بھی اس تیسرے درجہ میں آتا ہے پھر بعض باتیں اچھی ہیں۔ بعض ان سے بہتر اور زیادہ ضروری ہیں۔ ان میں آپس میں تمیز کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ کون سی بالکل ضروری ہے

اور کونسی ایسی ہے کہ اسے غیر ضروری خیال کیا جا سکتا ہے ؛

عام علماء کے نزدیک یہ جو تیسرا درجہ اوپر بیان ہوا ہے ۔ یہ مغز یا گودے اور موتی کی مانند ہے ۔ بڑے بڑے تحقیق کرنے والے عقلمند قانون داں (فقہا) نے محنت سے خدمت کر کے اس فن کو بھی مکمل کر دیا ہے +

علم اسرار دین | لیکن ہمارے نزدیک حدیثوں کے متعلق تمام فنوں میں سے سب سے زیادہ باریک اور گہری بنیاد والا اور دور تک روشنی پہنچانے والا فن اور اسلام کی شریعت کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام علموں میں سب سے اونچے درجے کا علم وہ ہے جس کا نام ہم علم اسرار دین رکھتے ہیں +

اس علم میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ حدیثوں میں جو حکم دیئے گئے ہیں وہ کیوں دیے گئے ہیں ؟ ان میں کیا کیا حکمتیں ہیں ؟ وہ کیا ضرورتیں ہیں جن کی وجہ سے حکموں میں درجے پیدا کئے گئے ہیں ؟ یعنی کسی کو کم ضروری اور کسی کو زیادہ ضروری اور کسی کو بہت ہی ضروری بتایا گیا ہے[1] +

اس کے ساتھ اس علم میں اس بات پر بھی بحث ہوتی ہے کہ کسی حکم کے بجا لانے کی جو خاص صورت بیان کی گئی ہے ۔ وہی خاص شکل کیوں بتائی گئی ہے ۔ نیز اگر کسی عمل یا کام کا کوئی وقت مقرر کیا گیا ہے ، تو وہ خاص

---

[1] مثلاً ایک نماز ہے جو فرض ہے ۔ دوسری قسم کی نماز نفل ہے یعنی فرض سے زائد کہ اگر وقت یا طاقت ہے تو ادا کر لی جائے نہیں تو نہ سہی ؛

وقت کیوں مقرر کیا گیا ہے +

ہمارے نزدیک جو عالم لوگ ان باتوں پر غور کر سکیں اُن کے لئے اس علم کی طرف دھیان دینا زیادہ ضروری ہے۔ اگر وہ اَور علموں کی طرف دھیان نہ دیں کر اُس کی طرف دھیان دیں تو بہت اچھا ہے۔ ایسے لوگ فرض عبادتیں ادا کرنے کے بعد اپنی زندگی کا بہترین حصہ اس علم کی باتوں پر غور کرنے میں صرف کریں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں ترقی کرنے کا اس علم کو ذریعہ بنائیں +

اس علم کے فائدے | یہ وہ علم ہے جس کے مطالعے سے انسان میں بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ گویا شرعی قانون کی حکمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ اس لئے حدیث کے عام علموں کی جن کا اوپر ذکر آچکا ہے اس علم ــــــ علم اسرار دین ــــــ سے وہی نسبت سمجھنی چاہئے جو شعر پڑھنے والوں کو علم عروض (شعروں کا وزن معلوم کرنے کے علم) سے ہے کیونکہ علم عروض جانے بغیر انسان شعروں کو اچھی طرح پرکھ نہیں سکتا کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔ اسی طرح حکماء اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لئے دلیلیں دیا کرتے ہیں اُن کے سمجھنے کے لئے منطق کے علم کی ضرورت ہے ویسے ہی حدیث کے علموں کو صحیح طور پر اور پورے طور پر سمجھنے کے لئے **علم اُسرار دین** کے سمجھنے کی ضرورت ہے +

جو شخص اس علم کا پوری طرح ماہر ہو جائے وہ پھر اندھیری رات میں

لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح نہیں ہوتا جو کبھی لکڑی کی جگہ سانپ پر بھی ہاتھ ڈال بیٹھتا ہے۔ نہ وہ سیلاب میں غوطہ لگانے والے کی طرح ہوتا ہے کہ موتی کی تلاش میں اپنی جان بھی کھو بیٹھتا ہے۔ پھر نہ وہ اندھوں کی طرح راہ چلتا ہے نہ اندھیری رات میں اندھی اونٹنی کی سواری کرتا ہے۔ اب وہ اُس نیم حکیم کی مانند بھی نہیں ہوتا جو کسی طبیب کو دیکھتا ہے کہ وہ بیمار کو سیب کھانے کا حکم دیتا ہے تو وہ نیم حکیم بھی اندرائن کو سیب کی شکل و صورت پر قیاس کر کے اُسی کے کھانے کا حکم دے دیتا ہے حالانکہ اندرائن بے حد کڑوا پھل ہے گو قد اور شکل کے لحاظ سے سیب ہی کی مانند ہے +

اس علم میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد مومن اپنے دل کی گہرائی سے شہادت دیتا ہے کہ جو دین خدا کی طرف سے ملا ہے وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معتبر آدمی بتائے کہ سنکھیا کھانے سے انسان مر جاتا ہے اور سننے والا اسے سچ مان لے۔ یہ ایک منزل ہے؛ اس کے بعد سنکھیے کی خاصیتوں کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد جان لے کہ چونکہ اس میں انتہائی درجے کی گرمی اور خشکی پائی جاتی ہے جو انسان کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے زہر انسان کو ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔ خاصیتوں کے اس طرح معلوم کر لینے سے اُس کے یقین میں ضرور اضافہ ہو جائے گا +

کیا یہ علم بدعت ہے؟ | اس علم کے اُصول آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حدیثوں

سے ثابت ہیں اور صحابہ[۱] اور تابعین[۲] نے اس کی اُن باتوں کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر طور پر بیان کی تھیں، ذرا کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور ائمہ مجتہدین[۳] غور کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ حکمت اور دانش مندی کی جو باتیں اسلامی قانون میں پائی جاتی ہیں اُنہیں قانونی کتابوں کے ہر ایک باب میں بتا دیا ہے +

ان مجتہد اماموں کے طریق پر چلنے والے محققین[۴] نے بھی حکمت کے بہت سے مسئلے صاف صاف بیان کر دیے اور اس طرح اس علم کی تحقیق بڑھتی گئی۔ اور جن لوگوں نے اسلام کے بنیادی قانون کو سمجھا اور اُس کے ماتحت ضمنی قاعدے بنائے اُن کے پاس اِس دینی تحقیق کا بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اب اس علم میں بحث کرنا اللہ کے فضل سے ایسا نہیں کہ کوئی شخص کہہ سکے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ اس کے خلاف ہے یا اس علم میں تحقیق کرنے والا اپنے آپ کو اندھیرے میں پائے۔ یہ سب کچھ درست ہونے پر بھی

---

[۱] صحابہ :- وہ لوگ جنھوں نے آنحضرت صلعم پر ایمان لاکر آپ کے ساتھ مل کر کام کیا +

[۲] تابعین :- وہ مسلمان لوگ جنھوں نے نبی اکرم صلعم کے صحابیوں کو پایا اور اُن سے فیض حاصل کیا +

[۳] ائمہ مجتہدین :- وہ امام جنھوں نے قرآن حکیم، حدیث اور صحابہ کے فیصلوں کو سامنے رکھ کر قانون وضع کئے +

[۴] محققین :- تحقیق کرنے والے، بات کی اصلیت معلوم کرنیکی کوشش کرنے والے +

کہا جا سکتا ہے کہ اس فن پر بہت تھوڑی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بہت کم عالم ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے پوری طرح سوچ بچار کرکے اس فن کے بنیادی قاعدے بنائے ہوں اور پھر ان بنیادی قاعدوں سے اصول اور ان سے شاخیں نکالی ہوں یا کسی ایک مصنّف نے اس فن پر اتنا کچھ لکھ دیا ہو کہ اس فن کا شوق رکھنے والے طالب علم کی پیاس بجھا سکے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ عربی دُنیا میں ایک مثال مشہور ہے کہ جب تو شیر پر سوار ہوگا تو تیرے پیچھے کون بیٹھے گا؟ پس اس فن پر کچھ لکھنا شیر کی سواری کرنا ہے۔

اس علم پر کون لکھ سکتا ہے؟ اس علم پر بحث کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی شریعت سے تعلق رکھنے والے سب علموں کا پُورا پُورا ماہر ہو۔ اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملوں میں اپنی ایک خاص رائے رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کا سینہ اتنا کھلا ہو کہ جو علم اُسے اُستاد کی تعلیم کے بغیر براہِ راست خدا تعالےٰ کی طرف سے دیا جاتا ہے اُسے لے سکے اور اُس کا قلب اس قسم کی دی ہوئی معلومات سے بھرا ہوا ہو۔ اس علم پر لکھنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاف طبیعت رکھتا ہو۔ بات کو جلد سمجھ سکتا ہو۔ بولنے اور لکھنے میں ماہر ہو۔ اپنا مطلب نہایت عمدہ طریق سے بیان کر سکے اور یہ بھی جانتا ہو کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور پھر اُن کے ماتحت ضمنی قاعدے کیسے چلائے جاتے

ہیں اور اصولی قاعدے بنانے کے لئے اُن کی بنیاد اُٹھانا بھی جانتا ہو اور پھر اِن قاعدوں کے لئے عقلی اور نقلی شواہد[1] بھی لاسکتا ہو +

مجھے اللہ تعالےٰ نے جو بڑی نعمتیں دے رکھی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے علمِ اسرارِ دین کی بہت زیادہ سمجھ حاصل ہے۔ پھر بھی مَیں مانتا ہوں کہ مَیں اس علم میں کامل نہیں ہُوں بلکہ میرا علم بھی ناقص ہے۔ مَیں یہ بھی مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوسکتی ہے کیونکہ انسان کا نفس اُسے بُری باتیں کرنے کو کہا ہی کرتا ہے +

یہ کتاب کیوں لکھی گئی ؟ | بات یُوں ہُوئی کہ ایک روز مَیں عصر کی نماز پڑھ کر اللہ سے دھیان لگائے بیٹھا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مبارک روح آئی ہے۔ اُس نے مجھے کوئی چیز اُڑھائی اور مجھے ایسا خیال ہُوا گویا کوئی چادر مجھ پر ڈالی گئی ہے۔ اس حالت کا مطلب میرے دل میں یہ ڈالا گیا کہ یہ دینِ اسلام کو نئی طرز سے بیان کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اُس دن سے مَیں اپنے سینے میں ایک نُور سا پاتا ہوں جو ہر وقت پھیلتا جاتا ہے۔ اِس کے کچھ عرصہ بعد مجھے الہام ہُوا کہ میرے متعلق یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ مَیں ایک نہ ایک دن دین کا یہ بڑا کام ضرور

[1] عقلی شواہد: کسی قاعدے کو ثابت کرنے کے لئے وہ باتیں بیان کرے جن کو عقل دیل سے صحیح مان لے۔
" نقلی شواہد: کسی قاعدے کے صحیح ثابت کرنے کیلئے "دینی" کتابوں میں سے دلیلیں پیش کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ فلاں حدیث میں یا فلاں بڑے عالم کی کتاب میں یُوں لکھا ہے +

کروں گا۔ اب زمین اپنے رب کے حکم سے جگمگا اٹھی ہے اور غروب کے وقت شعاعیں انسانوں پر اسی طرح پڑنے لگی ہیں جیسے طلوع کے وقت پڑتی تھیں[1]
اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب وقت آگیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اس زمانے میں سائنٹیفک دلیلوں سے پوری طرح ثابت کی جائے۔
اس کے بعد میں نے حضرت امام حسن[2] رضؓ اور حضرت امام حسین[3] رضؓ کو خواب میں دیکھا۔ اس وقت میں مکہ مکرمہ میں تھا۔ مجھے ایسا خیال ہوا کہ گویا انہوں نے مجھے ایک قلم دے کر فرمایا کہ یہ ہمارے نانا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔

تصنیف میں دیر کیوں لگی؟ — علم اسرار دین — اس کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اس علم پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھوں جو ایسی سلجھی ہوئی

---

[1] یعنی اس زمانے کے لوگ دین کو اسی طرح سمجھ سکنے کی طاقت اور قابلیت رکھتے ہیں۔ جس طرح حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سمجھ سکے تھے (مولانا سندھی) یا مشرق (ہندوستان) سے طلوع ہونے والے آفتاب (حضرت امام صاحب کی حکمت) کی روشنی مغرب (Occident) تک پہنچے گی اور مغربی حکماء بھی ان مسائل کو سمجھ سکیں گے۔ (مرتب)

[2] حضرت امام حسن رضؓ حضرت علی رضؓ چوتھے خلیفۂ اسلام کے بڑے بیٹے ۶۲۵ء میں مدینہ میں پیدا ہوئے ۶۷۰ء میں وفات پائی۔

[3] حضرت امام حسین رضؓ حضرت علی رضؓ کے بیٹے ۶۲۶ء میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ۵۷ سال کی عمر میں کربلا کے میدان میں شہید ہوئے۔

زبان میں ہو کہ اُسے شہری اور دیہاتی برابر سمجھ سکیں اور وہ عام اور خاص مجلسوں میں پڑھی جا سکے۔ مگر ایک چیز مجھے اس بات سے روکتی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ مجھے اپنے اردگرد کوئی ایسے عالم نظر نہ آتے تھے کہ مشکل آپڑنے پر اُن سے بات چیت کر کے سمجھ سمجھا لیا کروں۔ مجھ میں یہ کمزوری بھی تھی کہ میں اُن علموں کا ماہر نہیں تھا، جن میں وہ باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کا تعلق حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور آپ کے قریب کے زمانے سے ہے۔ اور یہ چیز بھی میرے ارادے کو کمزور کردیتی تھی کہ میں ایسے زمانے میں ہوں جس میں جہالت اور تعصّب کا زور ہے اور ہر ایک شخص اپنی ہی رائے کو سب سے زیادہ قدر کے قابل سمجھتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات بھی ہے کہ ایک زمانے کے عالم ہمیشہ ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص کوئی کتاب لکھے تو اُسے بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ اب میری یہ حالت تھی کبھی تو ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور کبھی ایک قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے قابلِ عزّت دوست محمد جو عاشق کے نام سے مشہور ہیں۔ اس علم ـــ علم اسرارِ دین ـــ کی قدر و قیمت اور اس کے بلند مرتبے سے واقف ہو گئے۔ انہیں الہام کے ذریعے سے یہ بات اچھی طرح یقین کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ انسانی نوع

کی سعادت[۱] اس علم کی گہری باتوں کی تحقیق کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی اور یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اس علم کو تحقیقات کی انتہا پر پہنچانے کے لیے شکوک اور شبہات کے ساتھ بڑے زور کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے (اور وہ خود یہ کر نہیں سکتے تھے) پھر بھی وہ سمجھے تھے کہ ان جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ایسے ماہر اُستاد کی ضرورت ہے جو پہلی مرتبہ اس علم کا دروازہ کھٹکھٹائے اور جو مشکل مسئلوں کے حل کرنے کی پوری پوری طاقت رکھتا ہو۔ وہ ایسے ماہر کی تلاش میں جا بجا پھرے اور جن اچھے لوگوں سے توقع ہوسکتی تھی اُن کی حالت کی جانچ پڑتال کی۔ لیکن ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کے بعد اُن کی رائے ہوئی کہ کوئی فائدہ مند بات کہنے والا آدمی نہیں ملتا اور نہ اِس علم کی روشنی دکھلانے والا کوئی نظر آتا ہے۔

تصنیف کی طرف توجہ جب اُنہوں نے یہ دیکھ لیا، تو میری طرف متوجہ ہوئے؛ جب میں عذر کرتا کہ میں اس قابل نہیں ہوں

---

[۱] انسانی سعادت سے انسان کی بھلائی مُراد ہے جس کا مطلب یہ کہ انسان وہ کام کرے۔ جو اُس کی فطرت کے مطابق ہیں اور جن کے کرنے سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی اچھی طرح بسر کرسکے۔ اس دُنیا کی زندگی میں سعادت کا قائم مقام انسان کی بدنی صحت ہے۔ جس کے قائم رکھنے کے لیے انسان کو ایسی غذا کھانی چاہیئے جو اس کے بدن کے مناسب ہو (مرتب)

کہ اس علم پر کچھ لکھوں، تو مجھے لگام والی حدیث یاد دلاتے[۵۱] -
چنانچہ اُنھوں نے مجھے بالکل لاجواب کر دیا - اور میرے لیے
بھاگنے کی کوئی راہ نہ چھوڑی - اب مجھے بھی یقین ہو گیا کہ قدرت
کو کوئی بہت ہی بڑا واقعہ عمل میں لانا ہے[۵۲] - اور وہ جو مجھے الہام
ہُوا تھا کہ مَیں یہ کام کروں گا یہ اسی کی ڈول پڑ رہی ہے - میرے
دِل میں اس بات کا یقین پیدا ہو گیا کہ یہ قدرتِ الٰہی سے ہونے
والی چیز ہے اور ہر طرف سے اس کے اسباب جمع ہو گئے ہیں -
اس لیے اب مَیں نے اللہ کی طرف دھیان کیا اور اس سے دُعا کی کہ
وہ میرے لیے صحیح اور سیدھا راستہ کھول دے - چنانچہ مَیں نے اپنی
طاقت اور قوّت سب اللہ کے سامنے چھوڑ دی اور اس طرح ہو گیا
جیسے مردے کی لاش غسل دینے والے کے ہاتھوں میں ہوتی ہے - اور
میرے دوست نے جس بات کی طرف توجّہ دلائی تھی اُسی کے کرنے میں

---

۵۱ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ جانتا ہو اور طالب علم اُس سے دریافت کریں اور وہ اُنہیں نہ بتائے بلکہ علم کو چھپائے تو قیامت کے بعد اُسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

۵۲ یعنی اس علم کے متعلق اس کتاب کی تصنیف نسانی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ثابت ہو گی اور جس طرح اور بہت سے انقلابات ہوئے ہیں یہ بھی ایک بہت بڑا انقلابی کارنامہ ثابت ہو گی - چنانچہ حضرت امام کا یہ خیال صحیح ثابت ہُوا - حجۃ اللہ البالغہ دُنیا کے انقلابی ادبیات میں چوٹی کی تصنیف ہے جو اللہ نے چاہا تو برعظیم ہند میں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو گی (مرتّب)

لگ گیا۔ مَیں نے عاجز ہوکر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ وہ میرے دل کو بے کار باتوں سے دُور رکھے اور تمام چیزوں کی جو اصل حقیقت ہے وہ مجھے دکھائے اور میرے دِل اور زبان کو توفیق دے اور جو بات کہوں اُس میں مجھے غلطی سے بچائے اور سچ کہنے کی توفیق دے اور جو بات میری سمجھ میں آئے اُسے بیان کرنے کی قابلیّت دے۔ وہ بہت نزدیک ہے اور سُنتا ہے۔

کتاب کے نام کی وجہ | مَیں نے اپنے دوست سے عرض کی کہ میں خاموشی پسند انسان ہوں۔ لڑنے جھگڑنے سے ہمیشہ بچتا ہوں۔ جو کچھ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اُسی پر قناعت کرتا ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مَیں کتابوں کے صفحے اُلٹتا رہوں اس لیے کہ مجھ پر ایک خاص کیفیّت طاری ہے۔ جس سے مجھے ان باتوں کے لیے فرصت نہیں ملتی۔ اور نہ میرے لیے یہ آسان ہے کہ مَیں سُنی ہوئی روایتیں انتہا تک یاد کرتا رہوں اور ہر آنے جانے والے سے بحث کر کے منوانے کی کوشش کروں۔ میں اس علم میں تنہا ہی ہوں۔ اور میں کسی خاص مسلک کا پیرو نہیں ہوں۔ جو کچھ آج کی ضرورتیں ہیں انہی پر نگاہ رکھتا ہوں اور جو کچھ غیب سے مل جاتا ہے اسی کا پابند ہوں۔ اور جو کچھ بغیر محنت اور تکلیف کے مل جاتا ہے اُسے غنیمت سمجھتا ہوں۔ اس لیے اگر کسی کو اتنی بات پسند آئے جو مَیں پیش کر سکتا ہوں تو اُس کی بہت مہربانی ہے ورنہ جو اُس کے جی میں آئے کرتا رہے۔

قرآنِ حکیم کی ایک آیت میں آتا ہے کہ وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ۔ اس آیت

میں انسان کی ذمہ داری اور اُس کے کرموں کے پھل اور خدا تعالےٰ کے بھیجے ہوئے قوانین کی حکمت کی طرف اشارہ ہے چونکہ یہ چھوٹی سی کتاب اسی علم کی شاخ ہے اس لیے مناسب معلوم ہُوا کہ اس کا نام حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه رکھا جائے۔ حَسْبِیَ اللّٰه نِعْمَ الْوَكِيْل وَلَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِيْم (یعنی اللہ تعالیٰ ہی میرے لیے کافی ہے۔ وہی میرا بہترین حفاظت کرنے والا ہے اس کے سوا غلطی سے بچانے والا کوئی نہیں اور نہ اور کوئی طاقت ہے جو نیکی پر لگا سکتی ہے یہ سب کام اُسی کی دی ہوئی طاقت سے ہو سکتے ہیں)۔

مقدّمہ

مُقدّمہ

کیا شرعی حکموں میں کوئی مصلحت نہیں ہے؟ کبھی کبھی لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کے شرعی حکموں میں کوئی حکمت[1] یا مصلحت[2] نہیں ہے۔ اور انسان جو کام کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس کا جو پھل دیتا ہے ان دونوں میں آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک کسی انسان کا اسلام کی شریعت یا قانون کے حکموں کی فرمانبرداری کرنے کی ذمہ داری کی مثال ایسی ہے جیسے

---

[1] حکمت: وجہ، سبب، یعنی وہ اصل چیز جس کی وجہ سے کوئی حکم دیا جاتا ہے مثلاً نماز پڑھنے میں یہ حکمت ہے کہ انسان اللہ کے سامنے عاجزی ظاہر کر کے اس سے مدد حاصل کرے (مرتب)

[2] مصلحت: وہ فائدہ جو حاصل کرنے کے لیے کوئی کام کیا یا کرایا جاتا ہے۔ مثلاً کُلّی کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ دانت اور منہ صاف ہو جائیں (مرتب)

کوئی شخص اپنے نوکروں کی فرمانبرداری کا امتحان لینے کے لیے نہیں کسی پتھر کے اُٹھانے کا حکم دیتا ہے یا کسی درخت کو ہاتھ لگانے کے لیے کہہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن حکموں میں نوکروں کا امتحان لینے کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب وہ نوکر یا تو اپنے مالک کا حکم مان لیں گے یا نہیں مانیں گے۔ دونوں صورتوں میں اُن کے کاموں کے مطابق انہیں جزا (اچھا پھل) یا سزا (بُرا پھل) مل جائے گی۔

یہ نہایت غلط خیال ہے۔ کیونکہ | قرآن اور حدیث اسے غلط قرار دیتے ہیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کے اور آپ کے بعد کے خیر و برکت والے زمانے کے عالموں کی متفقہ رائے اسے جھٹلاتی ہے۔ ایک عالم کم سے کم اتنا تو سمجھ سکتا ہے کہ ہاتھ پاؤں کے کاموں کا انسان کے دل کی نیّتوں کے مطابق حساب لگایا جاتا ہے۔ نیّتوں سے مُراد انسان کے نفس کی وہ کیفیّتیں ہیں جو انسان کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر اُکساتی رہتی ہیں۔ چنانچہ خود آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (یعنی انسان کے کاموں کی جانچ پڑتال اُس کے دل کی نیّتوں کے مطابق ہوتی ہے) ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (یعنی اللہ کے پاس اُن جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ لیکن اللہ کے پاس تمہارا خدا پرستی کا ارادہ پہنچتا ہے)[1]

نماز کی مثال | کون نہیں جانتا کہ نماز اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ انسان خدا تعالیٰ

[1] ۲۲: ۳۷

کو یاد کرے۔ اور اُس کے سامنے اپنے دل کا بھید کھولے اور عاجزی کے ساتھ باتیں کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (یعنی میری یاد قائم کرنے کے لیئے نماز قائم کرو[۵۱]) نیز نماز اس لیے بھی مقرر کی گئی ہے کہ وہ انسان میں یہ طاقت پیدا کر دے کہ وہ اپنی دوسری زندگی میں خدا تعالیٰ کو دیکھ سکے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ کَمَا تَرَوْنَ ھٰذَا الْقَمَرَ؛ لَا تُضَامُّوْنَ فِیْ رُؤْیَتِہٖ، فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰی صَلٰوۃٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَصَلٰوۃٍ قَبْلَ غُرُوْبِھَا، فَافْعَلُوْا (یعنی تم جیسے آسانی سے اس چاند کو دیکھتے ہو اُسی طرح اپنے رب کا دیدار بھی کر سکو گے۔ اس لیئے جہاں تک ہو سکے سب نمازوں کی پابندی کرو۔ خاص کر سورج نکلنے سے پہلے کی نماز اور سورج ڈوبنے سے پہلے کی نماز کی[۵۲])

زکوٰۃ کی مثال | یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اسلامی شریعت میں زکوٰۃ اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ انسان سے کنجوسی اور بخل کی بُری عادت ترک کرا دی جائے تاکہ محتاجوں کی ضرورت پوری کرنے کا سامان بہم پہنچ سکے۔ جیسے قرآن حکیم میں ہے کہ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ

---

۵۱ ۲۰ : ۱۴

۵۲ کیونکہ صبح کا وقت نیند کا وقت ہوتا ہے اور عصر کا سیر و تفریح اور کام کاج کی زیادتی کا وقت ہوتا ہے اس لیے ان وقتوں میں نماز ترک ہو جا سکتی ہے۔ ان نمازوں کی پابندی بہت خیال اور ہمت چاہتی ہے اس لیے اِن کی پابندی سے انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے زیادہ تیار ہوتا ہے (مرتب)

هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل یعنی مال و دولت میں سے کچھ دیا ہے، وہ جو اُس کے دینے میں کنجوسی یا بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اُن کے لیے اچھا ہے نہیں بلکہ یہ ان کے لیئے نہایت ہی بُرا ہے وہ جس چیز کا بُخل کر رہے ہیں آگے چل کر قیامت کے دن اس کا طوق پہنائے جائیں گے[۵۱])

روزے کی مثال یہ بھی معلوم ہے کہ روزہ اس واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پالے۔ جیسے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (یعنی امید کی جاتی ہے کہ تم با قاعدہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے بن جاؤ گے[۵۲]) یا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کہ "روزہ اس کے لیے خصّی کرنے کا ذریعہ ہے[۵۳]"

حج کی مثال یہ بھی معلوم ہے کہ حج اس لیے مقرر ہوا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے نام یاد دلانے والی چیزوں کی عزّت کی جائے۔ جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا (یعنی پہلا گھر جو لوگوں کے لیے خدا یاد کرنے کے واسطے بنایا گیا، وہ

---

۵۱ ۳: ۱۸۰

۵۲ ۲: ۱۸۳

۵۳ یعنی جس طرح خصّی ہونے کے بعد نفس کی بُری خواہش مٹ جاتی ہے اسی طرح سے اگر شرعی قاعدے کے مطابق روزہ رکھا جائے تو وہ بھی انسان کی بُری خواہشوں کو روک دیتا ہے۔ (مُرتّب)

وہ ہے جو مکّہ میں ہے[۱] نیز فرمایا۔ کہ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ (یعنی صفا اور مروہ خدا یاد دلانے والی چیزوں میں سے ہیں[۲])

قصاص کی مثال | یہ بھی معلوم ہے کہ قصاص (قتل یا زخم کا بدلہ) اس لیے مقرر ہوا ہے۔ کہ لوگوں کو قتل سے روکا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ (یعنی اے عقلمندو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے[۳])

قانونی سزاؤں کی مثال | یہ بھی معلوم ہے کہ سزائیں اور کفّارے (جرمانے) اس لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ گناہوں سے روکنے کا ذریعہ بنیں۔ جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ لِیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ (یعنی وہ اپنے کیے کا وبال چکھیں[۴])

جہاد کی مثال | یہ بھی معلوم ہے کہ جہاد اس لیے مقرر کیا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا قانون تمام دوسرے قانونوں کے اُوپر رہے اور ہر قسم کا فتنہ اور فساد اور بدنظمی دُور کر دی جائے۔ جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (یعنی ان سے لڑو یہاں تک کہ بدنظمی دُور ہو جائے اور ساری قوم اللہ کے قانون کی تابع بن جائے[۵])

آپس کے معاملات کی مثال | یہ بھی معلوم ہے۔ کہ آپس کے لین دین کے معاملات اور مرد اور عورت کے نکاح وغیرہ کے قانون اس لیے مقرر ہوئے ہیں

۱؎ ۳: ۹۶ ۲؎ ۲: ۱۵۸ ۳؎ ۲: ۱۷۹ ۴؎ ۵: ۹۵

۵؎ ۸: ۳۹

کہ انسانی سوسائٹی میں عدل اور انصاف قائم کیا جا سکے +

اس طرح کے اور بہت سے حکم ہیں جو قرآنِ حکیم کی آیتوں اور آنحضرت صلعم کی حدیثوں سے ثابت ہیں اور ہر زمانے کے عالم اُن کی حکمت کھول کھول کر بیان کرتے آئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں سکتا تو یوں خیال کرنا چاہیے کہ اُسے علم سے کچھ بھی مس نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنی عقل پر روئے۔ ایسا شخص اس قابل نہیں کہ اس کی کسی بات پر بھروسہ کیا جائے اور علمی محفلوں میں اس کا ذکر آئے +

نبیِ اکرم صلعم کی بتائی ہوئی حکمتیں | پھر یہ بات بھی ثابت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے کبھی کبھی بعض عبادتوں کے وقت مقرر کرنے کی حکمتیں بتا دی ہیں۔ جیسے ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھنے کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایسا وقت ہے کہ اس میں آسمانی رحمت کے دروازے کھلتے ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی نیک عمل اُوپر جائے +

آنحضرت صلعم سے یہ بھی روایت ہے۔ کہ عاشورے[۱] کے دن کا روزہ رکھنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ اس دن موسیٰ اور اُن کی قوم نے فرعون کے ظلم سے نجات پائی تھی اور ہم مسلمانوں کے ہاں اس لیے مقرر ہوا کہ ہم حضرت موسےٰ علیہ السلام کے طریق کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں +

اسی طرح آنحضرت صلعم نے بعض شرعی حکموں کے اسباب بھی

---

[۱] عربی ہجری سن کے پہلے مہینے یعنی محرم کی دسویں تاریخ کو عاشورہ کہتے ہیں۔

سمجھائے ہیں۔ مثلاً حکم یہ ہے کہ جب آدمی سو کر اُٹھے تو ہاتھ دھوئے بغیر پانی میں نہ ڈالے۔ آپؐ نے اس کا سبب یہ بتایا کہ" وہ نہیں جانتا کہ سوتے میں اُس کا ہاتھ کہاں کہاں لگتا رہا ہے"۔

ایسے ہی ناک صاف کرنے کے متعلق فرمایا کہ رات کو شیطانی قوت اُس کے ناک میں جمع ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی سونے سے وضو ٹوٹنے کے متعلق فرمایا کہ جب انسان لیٹ جاتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں[۵]۔

ایسے ہی منا میں کنکریاں مارنے کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے ہے۔

ایسے ہی اجازت لے کر گھر میں جانے کے متعلق فرمایا کہ یہ اِس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ انسان کی نظر پردے کی کسی چیز پر نہ پڑ جائے۔

بلّی کے جھوٹے کے متعلق فرمایا کہ وہ نجس (پلید) نہیں ہے اس لیے کہ وہ ہر وقت تمہارے گھروں میں آنے جانے والا جانور ہے۔

بعض موقعوں پر فرمایا کہ اس بات میں ایک فساد کو رفع کرنا مقصود ہے۔ جیسے دودھ پلانے کے زمانے میں عورتوں کے قریب

---

[۵] پٹھوں کے اس ڈھیلے پن کو دُور کرنے اور سستی کی جگہ چستی لانے کے لیے وضو کرنے کی ضرورت ہے (مرتب)

جانے سے منع کر دیا گیا ہے۔ کہ اس سے بچے کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہے[1]۔
کبھی دشمنوں کے ایک فریق کی مخالفت کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے۔
جیسے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سورج شیطان کے سینگوں پر نکلتا ہے۔
اُس وقت کافر لوگ (جو قرآن حکیم کا حکم پھیلنے سے روکتے ہیں) اُسے
سجدہ کرتے ہیں اِس لیے مسلمانوں کو اس وقت نماز سے روکا گیا ہے
تاکہ اُن کافروں سے مشابہت پیدا نہ ہو جائے۔

بعض موقعوں پر آنحضرتؐ نے کسی حکم کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ
دین میں ادل بدل ہونے کا راستہ بند ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص فرضوں
کے ساتھ ہی نفل پڑھنا چاہتا تھا حضرت عمر فاروقؓ نے اُسے یہ کہہ کر
روکا کہ اسی قسم کی بے احتیاطی سے پہلی قومیں برباد ہو چکی ہیں۔ اس پر
آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اور فرمایا کہ
اصاب اللّٰہ بک یا ابن الخطاب (یعنی اے ابن خطّاب! اللہ تعالیٰ
تجھے اس صحیح رائے کا اچھا بدلہ دے[2])

بعض دفعہ آپؐ نے کسی کام کی اجازت اس لیے دی ہے کہ دین میں

[1] مگر دوسری حدیث میں اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اہل کتاب یعنی
عیسائیوں اور یہودیوں کے کہنے پر کہہ دیا تھا جو دراصل مضر نہیں ہے (مرتّب)

[2] مطلب یہ ہے کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد کچھ دیر ٹھہر جانا چاہیے۔ اس کے
بعد نفل وغیرہ شروع کرنے چاہییں۔ اسی لیے حنفی قانون میں فرض نماز
کے بعد اُس جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ نماز پڑھنے کا حکم ہے تاکہ فرض کے بعد
تھوڑا سا دقفہ ہو جائے (مرتّب)

تنگی محسوس نہ ہو۔ مثلاً ایک ہی کپڑے میں نماز جائز ہے[1] +

ایسے ہی قرآن حکیم میں ہے کہ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ (یعنی اللہ جانتا ہے کہ تم لوگ اپنے نفسوں کو دھوکہ دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت کی اور تمہیں معاف کر دیا)[2] +

بعض موقعوں پر آپؐ نے عملوں کے متعلق عذاب ثواب بتاتے ہوئے حکمتیں بھی بتائیں اور اگر صحابہ کو کسی موقعے پر شُبہ پڑ گیا تو آپؐ نے اُن کا شُبہ بھی دُور فرما دیا۔ اور اسے ایک قاعدے کے اندر لے آئے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ آدمی جب جماعت کے ساتھ مل کر نماز پڑھتا ہے تو گھر میں نماز سے اُس کا ثواب پچیس گُنا بڑھ جاتا ہے اور پھر اس کی تفصیل یُوں فرمائی۔ کہ جب وہ گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف چلتا ہے تو اسے قدم قدم پر ثواب ملتا ہے +

---

[1] بعض دوستوں نے عرض کی کہ ہمارے پاس دو کپڑے موجود ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ سب کو تو دو کپڑے میسّر نہیں ہیں۔ اگر یہ لازم کر دیا جائے کہ نماز دو ہی کپڑوں میں ہوگی۔ تو بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھ سکیں گے +

[2] ۲ : ۱۸۷ رمضان کے مہینے میں بعض لوگ راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جاتے تھے اور اس کے لئے حیلے بہانے بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف کو دُور کر دیا اور انھیں اجازت دے دی کہ وہ راتوں کو اپنی بیویوں سے مل سکتے ہیں +

ایک اور موقعے پر فرمایا کہ تمھیں اپنی شہوت پوری کرنے پر بھی ثواب ملے گا۔ لوگوں نے تعجّب سے کہا کہ یا رسول اللہ شہوت پوری کرنا اور اجر؟ تو فرمایا کہ اگر کوئی شخص حرام طریقے پر شہوت پوری کرے تو اس پر اُسے گناہ ہوگا یا نہیں؟ تو اسی طرح اگر قانون کے اندر رہ کر شہوت پوری کرتا ہے تو اسے اجر ملنا چاہیئے۔

ایک اور موقعے پر فرمایا کہ جب دو مسلمان تلواریں کھینچ کر آمنے سامنے آجائیں تو قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا، دونوں جہنّم میں جائیں گے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ قاتل کا آگ میں جانا تو درست لیکن مقتول کا کیا قصور؟ آپ نے فرمایا کہ مقتول بھی تو یہی چاہتا تھا کہ اپنے مقابل کو قتل کر دے۔ یعنی وہ اتفاقاً قتل ہوگیا نہیں تو نیت تو اس نے قتل کرنے ہی کی کر رکھی تھی۔

اِن کے سوا اور بہت سے موقعے ہیں جن کا گننا بہت مشکل ہے۔

صحابہ کی بیان کی ہوئی حکمتیں | آنحضرت صلعم کے ساتھی بھی اسی طرح سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے جمعہ کے دن غسل کرنے کی حکمت بیان کی کہ عرب لوگ بڑے محنتی، جفاکش اور غریب ہوتے ہیں۔ محنت کرتے کرتے انھیں پسینہ آجاتا اور کپڑے بھیگ جاتے۔ جب ایسی حالت میں مجمع یا مجلس میں آتا تو دوسرے شخص کو اس کی بو سے تکلیف ہوتی اس واسطے ہفتے میں ایک بار یعنی جمعے کے دن غسل کرنا مقرر ہوا۔ اور زید بن ثابت نے اس حکم کی حکمت سمجھائی کہ جب تک میوہ پک نہ جائے اسے بیچنا

نہیں چاہیے۔ اِس لئے کہ اگر پکنے سے پہلے ہی کسی آسمانی آفت مثلاً آندھی، بارش وغیرہ سے تلف ہو جائے تو پھر خریدار کو بڑا گھاٹا رہے گا اور آپس کے فتنہ و فساد کی بنیاد کھڑی ہو جائے گی +

ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خانہ کعبہ کے چاروں کونوں میں سے دو کو ہاتھ لگانے کی علت بیان کی کہ جن دو کونوں کو ہاتھ لگایا جاتا ہے یہ حضرت ابراہیمؑ کی اُٹھائی ہُوئی بنیادوں پر قائم ہیں اور دوسرے دونوں کونے اصلی بنیادوں سے ہٹ گئے ہیں +

صحابہ کے بعد آنے والے لوگوں کی بیان کی ہوئی حکمتیں

پھر صحابہ کے بعد ان کے شاگرد تابعین بھی اسی طرح شرعی حُکموں کی حکمتیں بتاتے رہے۔ پھر ائمۂ مجتہدین ہر ایک حُکم کی کوئی نہ کوئی حکمت ظاہر کرتے رہے۔ وہ مصلحت کہیں تو کسی تکلیف دینے والی بات کو دُور کرنا ہے اور کہیں کوئی خاص فائدہ حاصل کرنا۔ یہ سب کچھ اِن عالموں کی کتابوں میں کھول کر بیان کیا ہُوا موجود ہے +

مُسلمان حکیم اور علمِ اسرارِ دین

پھر ان کے بعد امام غزالیؒ اور خطابی اور ابن عبدالسلام اور اُن جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے (خدا اِن کی کوششوں کو قبول فرما کر انھیں اچھا اجر عطا کرے) اُنھوں نے بڑی محنتوں سے شرعی حُکموں کے نہایت باریک نُکتے بیان کئے ہیں اور نہایت عمدہ سائنٹیفک تحقیقات بیان کی ہے +

عملوں کے اچھے بُرے ہونے کا صحیح قاعدہ

ہاں یہ بات صحیح ہے کہ جیسے سنّت[1] سے

[1] آنحضرت صلعم کا قول اور فعل وغیرہ۔

ثابت ہے۔ کہ ہر ایک حکم کے اندر ایک مصلحت ضرور موجود ہے اور وہ حکم دینے کا مقصد وہ مصلحت چلاتا ہی ہے اور اس پر تحقیق کرنے والے عالموں کی رائیں ایک ہو چکی ہیں، ویسے ہی یہ بھی صحیح ہے کہ شریعت کے حکموں میں جو خاص مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں انہیں الگ کر کے دیکھا جائے تو ان حکموں کو ماننے والوں کو اچھا اجر دینے اور نہ ماننے والوں کو سزا دینے میں یہ بات بجا اپنی جگہ قائم ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم نازل ہوا ہے (مطلب یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق حکم کا آجانا فرمانبرداری کی صورت میں ثواب اور نافرمانی کی حالت میں عذاب کا ایک مستقل سبب ہے، یہ سبب اس حکم کے اندر چھپی ہوئی مصلحتوں کے علاوہ ہے گویا عذاب یا ثواب کے دو بڑے سبب ہیں ایک تو وہ مصلحت اور حکمت جو کسی حکم میں موجود ہے دوسرے اس کا اللہ تعالےٰ کا حکم ہونا)+

یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی کام کا اچھا یا برا ہونا صرف اس مصلحت پر موقوف ہے جسے انسان کی عقل سمجھ سکے۔ ان لوگوں کے نزدیک شرعی قانون کا صرف یہ کام ہے کہ وہ بتا دے کہ اس کام میں فلاں مصلحت چھپی ہوئی ہے اور اس مصلحت کے مطابق اس کام کی یہ قیمت (ثواب) ہے۔ وہ اس بات کا حکم دینے کے لئے نہیں ہے کہ فلاں کام کرو اور فلاں نہ کرو۔ یعنی شرعی قانون کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے لائق کہتا ہے تو فقط اس مصلحت کی وجہ سے کہتا ہے جو اس کام میں چھپی ہوئی

ہوتی ہے۔ وہ کام اس لئے کرنے یا نہ کرنے کے لائق نہیں ہوتا کہ قانون اس کا حکم دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ڈاکٹر دوا کی خاصیتیں اور مرض کی قسم بتا دیتا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر کا حکم نہ ماننے سے مرض پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی طرح شرع کا حکم اس کی مصلحت سے الگ چیز ہے۔ اس کا مصلحت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے (کیونکہ اس میں کسی حکم کے قانون بن جانے سے اس کی تعمیل کی جو ضرورت پیدا ہو جاتی ہے اس سے بے پروائی برتی گئی ہے۔ اس لئے کہ جب کسی مصلحت کو سامنے رکھ کر کوئی قاعدہ بنایا جائے پھر اس قاعدے کو قانون بنا دیا جائے تو اب اس میں قانونی شان غالب رہے گی اور اس کی تعمیل قانون کی حیثیت سے ضروری ہوگی جیسے ایک افسر کا حکم اگر غلط بھی ہو ٹالا نہیں جا سکتا۔ قانون کہتا ہے کہ اس افسر کا حکم ماننا پڑے گا ہاں اگر حکم غلط ہو تو اس کے خلاف الگ طور پر چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ لیکن قانون افسر کے حکم کی فرمانبرداری سے انکار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا) سنت پر غور کرنے والا انسان سرسری نظر سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ یہ خیال ایک سائنٹیفک تعلیم کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے آنحضرت صلعم رمضان کی نماز کے بارے میں فرماتے ہیں کہ تم اسے اپنے گھروں میں پڑھا کرو اس لئے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے حالانکہ اگر مصلحت کی وجہ سے حکم مقرر ہوتے تو یہ نماز گھر میں پڑھی جاتی یا مسجد میں، دونوں صورتوں میں فرض ہونے کا سبب بن سکتی تھی۔ ایک

اُور حدیث میں آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے ایسی چیز کے متعلق دریافت کیا جو پہلے حرام نہیں تھی لیکن اُس کے پوچھنے کی وجہ سے حرام ہوگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال اور حرام ہونے کے اصول مصلحت کے سوا اُور بھی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گھر میں رہنے والے (مقیم) انسان کو جو اُتنا ہی مشکل کام کر رہا ہو جیسے مسافر کو سفر سے تکلیف ہوتی ہے روزہ نہ رکھنے کا اُسی طرح حق ملنا چاہئے تھا جیسے مسافر کو حق حاصل ہے، اسی طرح ایک امیر کے لئے جو نہایت آرام سے سفر کر رہا ہے روزہ افطار کرنا جائز نہ ہوتا۔ ایسے ہی ان سب سزاؤں کا حال ہے جو شارعؑ نے مقرر کی ہیں +

اصل قاعدہ یہ ہے کہ جب شارع کا حکم صحیح طور پر معلوم ہو جائے تو اسے یہ کہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کہ اِس کی مصلحت ابھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اِس لئے کہ بہت سے لوگوں کی عقلیں بہت سی مصلحتوں کو جو حکموں میں پائی جاتی ہیں پہچان نہیں سکتیں۔ نیز آنحضرت صلعم کی سمجھ ہمارے نزدیک ہماری اپنی عقلوں سے زیادہ اعتبار کرنے کے لائق ہے۔ چونکہ عام لوگ مصلحتیں سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے اس لئے مصلحتوں کا علم خاص خاص قابل لوگوں ہی کو بتایا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے عام لوگوں سے چھپایا جاتا رہا ہے اور اس علم میں رائے بنانے والے عالم کے لئے وہی شرطیں مقرر ہیں جو کلام اللہ یعنی قرآن حکیم کی تفسیر

لہ شریعت کا قانون بیان کرنے والا یعنی نبی اکرم صلعم +

کے لئے ضروری ہیں۔ انبیاء اور ان کے کامل پیروؤں کے طریقے سے باہر نکل کر خالص عقل سے جس قدر قاعدے ثابت ہوتے ہیں اُن کی بُنیاد پر اس علم میں بحث کرنا جائز نہیں ہے +

ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا ہے۔ اُس سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ شریعت لوگوں کو قانون کی پابندی کا جو حکم دیتی ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے ایک سردار کے نوکر بیمار ہوگئے۔ اُس نے اپنے خاص ڈاکٹروں میں سے ایک کو پورے اختیارات دے کر مقرر کردیا کہ وہ بیمار نوکروں کو دوا پلائے۔ اُس صورت میں اگر اُن بیمار خادموں نے اُس ڈاکٹر کی فرمانبرداری کی تو اُنھوں نے گویا اپنے سردار کا حکم مانا اس لئے سردار ان سے یقیناً خوش ہوگا اور انھیں اچھا انعام دے گا اور وہ مرض سے شفا بھی پا جائیں گے۔ لیکن اگر نوکروں نے اس ڈاکٹر کی نافرمانی کی تو یہ حقیقت میں اپنے آقا کی نافرمانی کرنا ہے۔ اس لئے سردار اُن پر بہت ناراض ہوگا۔ اور وہ اُنھیں بڑی سزا دے گا اور ساتھ ہی وہ بیماری کی وجہ سے مر بھی جائیں گے۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسی طرح اشارہ فرمایا۔ جب آپ نے فرشتوں کی زبان سے اس بات کا ذکر کیا کہ نبی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک کوٹھی بنائی اور اُس میں ہر قسم کی دعوت کا سامان تیار کرکے رکھا۔ اُس نے ایک آدمی بھیجا جو مہمانوں اور محتاجوں کو خبر دے کہ کھانا تیار ہے آکر کھالیں اب جس شخص نے اس پکارنے والے کی بات مان لی اور کوٹھی میں آگیا اس نے

خوب کھانا کھایا۔ لیکن جس نے اس کی بات نہ مانی وہ نہ تو اس کوٹھی میں آسکا نہ ضیافت میں شریک ہو سکا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور مثال یہ بھی دی ہے کہ میری اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی لوگوں کے پاس آیا اور اس نے کہا بھائیو! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر دیکھا ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ میں تمہیں اونچی آواز سے خبردار کرتا ہوں کہ "اگر تم اس سے بچنا چاہتے ہو تو یہاں سے جلدی بھاگ جاؤ"۔ چنانچہ ان لوگوں میں سے بعض نے اس کی بات مان لی اور راتوں رات وہاں سے نکل گئے۔ اور آرام سے چلتے رہے یہاں تک کہ لشکر کے حملے سے بچ گئے۔ مگر جن لوگوں نے اس کی بات نہ مانی۔ اور اسے جھٹلایا وہ صبح تک وہیں پڑے سوتے رہے یہاں تک کہ صبح سویرے لشکر پہنچ گیا جس نے ان کا ناس کر دیا۔

ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات اپنے ربّ سے روایت کر کے کہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے فرماتا ہے کہ "جو بدلہ تمہیں دیا جا رہا ہے یہ تمہارے ہی کرم ہیں جو تمہیں لوٹائے جا رہے ہیں"۔

امام صاحبؒ کا مسلک ہم نے یہاں جو کچھ بیان کیا ہے کہ گو انسان کے کرموں اور ان کے پھلوں میں خاص تعلق ضرور ہے پھر بھی کرموں کی اچھائی بُرائی خالی عقلی ہی نہیں ہے۔ اس میں ایک بات ہے جو دونوں کو جمع کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے کرم اور ان کے اندر کی مصلحت اور کسی کام کے کرنے نہ کرنے کا حکم

یہ دونوں باتیں مل کر عذاب یا ثواب پیدا کرتی ہیں۔ ہمارے اس بیان سے وہ مشکل مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جس پر عالم لوگ بحث کرتے رہے ہیں۔ کہ حضرت نبی اکرم صلعم سے پہلے کے لوگ جو کچھ کر کے مرگئے اُس پر اُنھیں عذاب یا ثواب ہوگا یا نہیں[1]؟

عالموں کے اعتراضات | عالموں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک حد تک یہ جانتے ہیں کہ شرعی حکموں کا تعلق خاص خاص مصلحتوں کے ساتھ ہے اور عملوں پر جزا یا سزا اس لیے ملتی ہے کہ وہ انسان کے نفس کی ان حالتوں سے پیدا ہوتے ہیں جو انسان کو اچھا یا بُرا بناتی ہیں۔ جیسے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ”اَلَا! فَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً؛ اِذَا صَلُحَتْ، صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ، وَاِذَا فَسَدَتْ، فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ؛ اَلَا! وَهِیَ الْقَلْبُ“ (یعنی دیکھو! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ اچھا بن جائے تو سارا جسم اچھا رہتا ہے؛ اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو وہ دِل ہے“) لیکن یہ عالم لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس علم پر کتابیں لکھنا اور اس کے اصلی قاعدے اور ضمنی قاعدے مقرر کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس علم کے مسئلے نہایت باریک اور گہرے ہیں اور پہلے زمانے کے لوگوں نے

[1] اس کا جواب یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے عملوں سے انسانیت کی اصلی مصلحتوں کو جتنا خراب کیا اُس کے متعلق طبعی طور پر ضرور اُن سے حساب ہوگا لیکن قانون کی حیثیت سے اُنھیں جن حکموں کی خبر نہیں ملی اُن سے وہ بری ہیں۔ اُن کی وجہ سے اُنھیں سزا نہیں ہوگی۔

اس علم کو علم کی حیثیت سے نہیں لکھا حالانکہ اُن کا زمانہ آنحضرت صلعم کے زمانے کے قریب تھا اور وہ اس علم کے بڑے ماہر تھے۔ گویا اُن سب کی رائے یہی ہے کہ اِس علم پر کچھ لکھنا اچھا نہیں ہے؛ بعض علم والے کہتے ہیں کہ اس علم پر کتابیں لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ شرعی قانون پر عمل کرنے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ انسان اس قانون کی مصلحتیں جانتا ہو یعنی اس علم کے پڑھنے سے عملی قوت کچھ زیادہ پیدا نہیں ہوتی +

ان اعتراضوں کے جوابات | لیکن سب باتیں غلط ہیں +

اس علم کے مشکل ہونے کا جواب | جو لوگ کہتے ہیں کہ اس علم پر کوئی کتاب لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے مسائل بہت گہرے ہیں اُن کا یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ مسئلوں کے باریک ہونے کے معنی یہ نہیں کہ کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔ دیکھئے توحید[1] کا علم اور اللہ تعالےٰ کی صفتوں کا علم اِس سے بھی زیادہ باریک ہے اور اِن کا سمجھنا بہت ہی مشکل ہے۔ پھر بھی لوگوں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور اللہ تعالےٰ نے اُنھیں آسان کر دیا۔ اور یہ باقاعدہ فن بن گیا +

بات یہ ہے کہ ہر ایک علم سرسری نظر میں ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ

---

[1] خدا تعالےٰ کے ایک ہونے کا علم۔ اِس میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ وہ ایک کس طرح ہے؟ اگر وہ ایک ہے اور تنہا ہے تو اس کائنات کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس کی صفات (Attributes) کیا ہیں وہ اس کی ذات کا جزو ہیں یا اس سے الگ ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہایت باریک اور مشکل مسئلے ہیں +

اُس پر غور کرنا ناممکن ہے۔ اور اُس کے مسئلوں کو سمجھنا دشوار ہے لیکن جب انسان قاعدے مقرر کر کے چلے اور ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی کی جائے اور ضروری آلات سے مدد لی جائے۔ تو لکھنے والوں میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس علم کے قاعدے بنائیں اور ان کی شاخیں نکالیں اگر مشکل کہنے سے یہ مُراد ہے۔ کہ اس مضمون پر لکھنا آسان نہیں تو یہ صحیح بات ہے لیکن اِس کے مشکل ہونے ہی کے سبب سے تو اِس علم پر لکھنے والوں کی برتری دوسرے عالموں پر ظاہر ہوتی ہے اور مشقتیں اُٹھانے ہی سے انسان کوئی مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ اور علم پر قبضہ کرنا عقل کو تکلیف دِئے بغیر اور سوچنے کی قوت میں انتہا تک پہنچے بغیر ناممکن ہے +

(۲) اس علم میں تصنیف نہ ہونے کا جواب بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے اس علم پر کچھ نہیں لکھا۔ اس لئے ہمیں بھی کچھ نہیں لکھنا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اس علم کے بنیادی قاعدے اور ان کی بعض شاخیں بتادی ہیں اور بڑے بڑے عقلمند صحابیوں، جیسے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ وغیرہ نے اس پر بحث کی ہے اور اس میں خاص نکتے پیدا کئے ہیں۔ اُن کے بعد دین کے عالم اور یقین حاصل کرنے والی جماعتیں اپنے اپنے زمانے کے مطابق ہمیشہ اس کی تحقیقات ظاہر کرتی رہی ہیں۔ بلکہ اگر کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو مسلمانوں کے دینی مسئلوں میں شک پیدا کرتے، تو اس زمانے

کے بڑے بڑے عالم کھڑے ہو جاتے اور بحث اور مناظرے سے ان شکوں کو دُور کر دیتے اور لوگوں کو دین کی خدمت کے لئے پکّے بنا دیتے اور اس طرح ہمیشہ دین میں نئی نئی غلط باتیں داخل کرنے والوں کو شکست دیتے رہتے تھے۔

اس کے بعد اب ہماری رائے یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس میں اس فن کی اکثر ضروری باتیں آجائیں۔ ہمارا یہ کام اِدھر اُدھر کی بہت سی کوششوں سے زیادہ فائدہ دینے والا ہوگا اور ہاتھی کا پاؤں ثابت ہوگا۔ جس میں بہت سی چیزیں آجائیں گی۔

پہلے زمانے میں اس علم پر کتابیں کیوں نہیں لکھی گئیں

پہلے زمانے کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت حاصل تھی اور حضور کے برکت والے زمانے کے قریب تھے۔ اِن میں آپس کے اختلافات بھی زیادہ نہیں تھے جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جاتی تھی، وہ اُسے پورے اطمینان کے ساتھ مان لیتے تھے؛ اِس لئے اِنھیں اس بات کی زیادہ ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی، کہ عقلی تحقیقات اور مذہبی باتوں کو ملائیں۔ جب کبھی ذرا سا شک پیدا ہوتا، وہ اپنے زمانے کے زندہ علماء سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ انھیں اس بات کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ اس علم پر کتابیں لکھتے۔

اس بارے میں علم اسرارِ دین کی مثال ویسی ہی ہے جیسے علم حدیث کی، کہ پہلی صدی میں حدیث کے بڑے بڑے عالم موجود ہونے کی وجہ سے انھیں حدیث کے علم پر کتابیں لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس زمانے میں ابھی حدیثوں

میں بہت اختلاف پیدا نہ ہوا تھا اور جھوٹی باتیں بنانے والے ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اگر کسی کو کسی حدیث یا روایت میں کوئی شبہ پڑتا، تو وہ اپنے زمانے کے عالموں سے پوچھ لیتا تھا۔ اِس لئے انھیں نہ تو غریب الحدیث[1] کی شرح لکھنی پڑی، نہ اسماء الرّجال[2] کی ضرورت ہوئی۔ اُنھوں نے نہ اصولِ حدیث[3] پر کتابیں لکھیں، نہ مختلف الحدیث[4] پر اور نہ فقہ الحدیث[5] پر۔ وہ نہ صحیح حدیثوں کو ضعیف حدیثوں سے جُدا کرنے پر، نہ روایات کی جانچ پڑتال کر کے جھوٹی اور سچّی روایتیں الگ الگ کرنے پر، متوجّہ ہوئے۔ اِن تمام علموں کے اصول اور شاخیں اُس وقت بنیں، جب عالموں کو بہت عرصے کے بعد اُن کی ضرورت پڑی اور حدیث سمجھنے کا فنّ ان علموں کے جاننے کے بغیر مشکل کیا نا ممکن ہو گیا +

اسی طرح جب شرعی قانون پر بحث کرنے والے فقہا میں اس وجہ سے اختلاف ہونے لگے کہ فلاں حکم کس وجہ سے دیا گیا تھا، تو حکموں کی علّتوں

---

[1] حدیث کے ان الفاظ کا بیان جو محاورے اور بول چال سے گر گئے اور ان کے بولنے اور جاننے والے تھوڑے رہ گئے +

[2] وہ علم جس میں ان لوگوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے جن سے حدیث کی روایتیں لی جاتی ہیں +

[3] وہ علم جس میں حدیثوں کی جانچ پڑتال کے قاعدے بیان کئے جاتے ہیں +

[4] وہ علم جس میں اُن حدیثوں پر بحث کی جاتی ہے جن میں ظاہر میں کوئی اختلاف پایا جائے +

[5] وہ علم جس میں حدیث سے قانون نکالنے پر بحث ہوتی ہے +

پر بحث کرنے کی ضرورت پڑی، تاکہ معلوم ہو کہ جو مصلحتیں شرع کے قانون میں سمجھی جاتی ہیں وہ علّتیں ان کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اب بعض لوگ لادینی عقلمند حکیموں کی باتوں کو دین کی باتوں میں سند کے طور پر پیش کرنے لگے اور مسلمانوں کو جن باتوں کو ماننا چاہیئے اور جن قاعدوں پر چلنا چاہیئے جب ان میں شک ڈالنے والی باتیں ظاہر ہوئیں، تو اس زمانے میں مذہب کی بتائی ہوئی باتوں کو عقل سے ثابت کرنا اور مذہب اور عقل کو ملا کر دکھانا دین کی بہت بڑی خدمت قرار پایا۔ اور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو جمع کرنا اچھی کوشش سمجھی گئی اور اسے بھی اونچے درجے کی عبادت سمجھا جانے لگا۔ بلکہ اللہ کے حکموں کی پیروی کرنے کی طرح اسے بھی اعلیٰ درجے کی پیروی قرار دیا گیا +

کیا کتابیں لکھنا بے فائدہ ہے ؟ (۳) بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ اس علم پر کتابیں لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس علم پر کتابیں لکھنے کے بہت فائدے ہیں +

پہلا فائدہ : قرآن کی حکمت کا اظہار اس سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بہت بڑے معجزے کی تشریح ہوتی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم قرآن حکیم لائے اور اس کے ذریعے سے اپنے زمانے کے لوگوں کو عاجز کر دیا اور ان میں سے کوئی شخص بھی قرآن کی ایک سورت جیسی سورت نہ بنا سکا۔ جب یہ پہلا زمانہ گزر گیا اور لوگوں کو یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ قرآن حکیم کی عبارت میں وہ کیا لفظی کمال ہے جس کی وجہ سے اسے معجزہ (عاجز کرنے والا) کہا گیا ہے۔ تو امت کے عالموں نے

کی ایک جماعت کھڑی ہوئی جس نے عربی زبان کے متعلق ایسے فن بنا دیئے، کہ اُن کے پڑھنے کے بعد انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کی بلاغت یعنی اس کی لفظی خوبیاں انتہا تک سمجھ لے +

اسی طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کی طرف سے (قرآن حکیم میں) ایک ایسا قانون بھی لے کر آئے ہیں جو تمام شریعتوں (قانونوں) سے زیادہ کامل ہے۔ جس میں اتنی مصلحتوں کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسان مل کر بھی کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جس میں اتنی مصلحتیں رکھی جا سکیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کے لوگ یہ معجزہ بھی بیان کر گئے ہیں۔ اُس زمانے میں اس معجزے کی تشریح کے جو طریقے ہو سکتے تھے اُنھوں نے اُن سے کام لیا اور وہ اس قانون کے سب سے بلند اور سب سے اچھا ہونے کے قائل ہو گئے۔ یہ اس زمانے کے خُطبوں اور محاوروں سے جو ہم تک پہنچے ہیں صاف ظاہر ہوتا ہے +

اب اُن کا زمانہ گزر گیا ہے اب اُمت میں ایسے عالم بھی ہونے چاہئیں جو قرآن کو ایک قانون کی حیثیت سے سب سے زیادہ کامل اور سب سے اچھا ثابت کر دکھائیں اور ثابت کر دیں کہ ہمارے رسول جیسے اُمّی بزرگ کا اس طرح کا شرعی قانون لانا ایک بہت بڑا معجزہ ہے +

دوسرا فائدہ: اطمینان کا حاصل ہونا | ایک مسلمان کو محض ایمان لانے سے جس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے اِس علم کے پڑھنے سے اُس سے زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مشہور مقولہ قرآن حکیم میں آیا ہے۔ کہ

بلیٰ وَلٰکِن لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِی (یعنی میرا ایمان تو ہے لیکن میں اپنے ایمان میں اطمینان پیدا کرنے کے لئے دیکھنا چاہتا ہوں)[۵] +

اس اطمینان کی اس لیے ضرورت ہے۔کہ اگر کسی بات کی کئی دلیلیں مل جائیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد کریں یعنی ایک دلیل سے جو بات ثابت ہوتی ہو وہی دوسری دلیل سے ثابت ہوتی ہو، تو اس طرح دل کے تشکوک دور ہوجاتے ہیں اور پورا اطمینان حاصل ہوجاتا ہے +

تیسرا فائدہ: عقل حاصل ہونا | اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں کرنا کہ گویا وہ نظر آرہا ہے یا کم سے کم یہ کہ وہ دیکھ رہا ہے، احسان کہلاتا ہے۔جب انسان اللہ تعالیٰ کے حکموں کو اس طرح ماننے لگے کہ گویا اللہ تعالیٰ براہ راست حکم دے رہا ہے تو انسان ضرور اس کی پیروی کرتا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ ہی ان حکموں کی حکمت اور مصلحت کا علم بھی حاصل ہوجائے تو گویا ان حکموں کی روح معلوم ہوجاتی ہے اب اگر اس روح کی حفاظت کی جائے، تو تھوڑی عبادت بھی زیادہ نفع دیتی ہے۔اور انسان اندھوں کی طرح کام نہیں کرتا۔یہی وجہ ہے کہ امام غزالی رحہ نے احسان اور تصوّف کی کتابوں میں عبادتوں کی حکمتیں بھی بتائی ہیں +

۵۔ ۲ : ۲۶۰

چوتھا فائدہ: اختلافات دُور کرنا | اسلامی شریعت کے سمجھنے والے لوگوں میں جنھیں فقہا کہتے ہیں۔ بعض مسئلوں میں اِس لئے اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک عالم کسی حکم کی ایک وجہ بیان کرتا ہے اور دوسرا دوسری وجہ بتاتا ہے۔ جب تک شرعی حکموں اور قانونوں کی علتوں پر بحث نہ کی جائے یعنی یہ نہ بتایا جائے کہ شریعت نے فلاں فلاں حکم کیوں دیا ہے۔ اُس وقت تک یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ جن دو عالموں میں اختلاف ہے اُن میں سے کس کا کہنا صحیح ہے اور کس کا غلط +

پانچواں فائدہ: شک پیدا کرنے والوں کی تردید | نئے نئے شک پیدا کرنے والے لوگوں نے اسلام کے مسئلوں کے متعلق یہ غلط خیال پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ عقل کے خلاف ہیں۔ اور جو چیز عقل کے خلاف ہو اُسے یا تو ماننا ہی نہیں چاہئے یا اس کے کچھ ایسے معنے لینے چاہئیں جو اُسے عقل کے قریب کر دیں۔ جیسے وہ قبر کے عذاب کے متعلق کہتے ہیں۔ کہ اِس قسم کا عذاب ہمیں قبر میں نظر نہیں آتا اور عقل اِسے مان نہیں سکتی کہ قبر میں انسان مر کر زندہ ہو اور پھر عذاب پائے۔ اسی طرح وہ انسانیت کے خاتمے کے بعد جب انسان دوبارہ زندہ کرکے جمع کئے جائیں گے اور اُن سے اُن کے کاموں کا حساب لیا جائے گا اور اُنھیں ایک راستے پر سے گزرنا پڑے گا جسے پُل صراط کہتے ہیں اور اُن کے عملوں کو ایک قسم کے ترازو کے ذریعے سے تولا جائے گا وہ ان سب باتوں میں شک ڈالتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ سب فرضی باتیں ہیں عقل اِنہیں نہیں مانتی۔

پھر وہ ان کو ایسے لفظوں میں بیان کرتے ہیں جنہیں وہ عقل کے قریب کہتے ہیں لیکن وہ اسلام کے اصول کے خلاف ہیں +

شک پیدا کرنے والوں کا ایک گروہ یعنی اسماعیلیہ[1] نے تو شکوک کو انتہا کو پہنچا دیا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ رمضان کے مہینے کا آخری دن ہو تو روزہ فرض ہے اور اس سے اگلے ماہ یعنی شوال کا پہلا دن ہو تو روزہ حرام ہے ؟ وہ اس قسم کے اور بھی بہت سے شکوک پیدا کرتے ہیں +

شک پیدا کرنے والی ایک جماعت نے ان مسئلوں کا مذاق اڑانا شروع کر رکھا جن میں کسی کام کے کرنے پر ثواب یا عذاب بتایا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف مذہب والوں کے ڈھکوسلے ہیں اور لوگوں کو کسی کام کے کرنے کا شوق دلانے کے لئے یا ڈرانے کیلئے ہیں یہاں تک کہ ایک بد بخت[2] نے تو ایک روایت گھڑ ڈالی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بینگن کے کھانے سے ہر وہ فائدہ حاصل ہوتا ہے جس ارادے سے اُسے کھایا جائے (اس طرح وہ بد بخت اس اصل حدیث کا مذاق اڑاتا ہے جس میں زمزم کے پانی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ پانی بہت فائدہ دینے والا ہے) گویا بینگن جو طبی لحاظ سے نقصان دینے والی چیز ہے مسلمانوں کے نزدیک فائدہ دینے والی چیزوں سے مختلف نہیں ہے اس قسم کے فساد کا دور کرنا ناممکن ہے جب تک کھول کھول کر نہ بتایا جائے کہ شریعت کے

---

[1] شیعوں کا ایک فرقہ [2] یعنی ابن الراوندی

حکموں میں کیا خوبیاں اور مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں اور یہ نہ بتایا جائے کہ ان حکمتوں کے معلوم کرنے کے کیا قاعدے ہیں۔ جیسے اس سے پہلے یہودیوں، عیسائیوں اور دہریوں کے ساتھ بحثیں کرنے کے دوران میں ایسے قاعدے بنانے کی ضرورت پیدا ہوچکی تھی۔ (یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کو بائیبل اور اس کی شرحوں پر پورا غور کرنا پڑا۔ اور دہریوں کے ساتھ مناظرے کرنے سے پہلے ان کے آپس کے اختلافات پر پوری نظر ڈالنی پڑی۔ یہ چیزیں پہلے زمانے کے مسلمان عالم ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب ان کی ضرورت پڑی، ان کا علم حاصل کرنا پڑا، اور ان پر کتابیں لکھنی پڑیں۔ اسی طرح اس زمانے میں شرعی قوانین کی حکمتوں پر غور کرکے ان پر کتابیں لکھنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا) +

<u>چھٹا فائدہ: علم حدیث کی خدمت</u> اسلامی شریعت کے ماہر قانون دانوں یعنی فقہا کی ایک جماعت کی رائے ہے۔ کہ جس حدیث کی تائید عام عقل کے قیاس سے نہ ہوتی ہو اسے نہیں ماننا چاہیئے۔ اگر اس قاعدے کو مان لیا جائے تو بہت سی حدیثیں چھوڑنی پڑتی ہیں جیسے "مُصرّات[1]" کی حدیث اور "قلتین[2]" کی حدیث

[1] مصراۃ کے معنی ہیں اونٹ یا بکری کے تھنوں میں دودھ جمع رکھنا تاکہ بیچتے وقت گاہک کو دھوکا دیا جاسکے اس بارے میں ایک حدیث ہے جس میں آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس قسم کی بکری یا خرید لے وہ تین دن تک آزمائشی طور پر اسے رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر اسے واپس کرنی ہو تو ایک [illegible] وغیرہ دے کر واپس کرے +

[2] قلہ بڑا مٹکا جس میں پانسو رطل یعنی سوا چھ من کے قریب پانی آتا ہے۔ اس بارے میں ایک روایت آتی ہے کہ اگر پانی دو قلہ یعنی بارہ من سے زیادہ ہو تو اس میں کچھ معمولی گندگی پڑ جائے جو نظر نہ آئے تو وہ پانی نجس یا گندہ نہیں ہوتا کہ اس سے وضو وغیرہ کرنا منع ہو +

ان روایتوں کو صحیح ماننے والی جماعتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ثابت کر دکھائیں کہ یہ حدیثیں شرعی مصلحتوں کے مطابق ہیں یعنی عقلی قیاس کے مخالف نہیں ہیں +

غرض علم اسرارِ دین[1] ایک علم کی حیثیت سے کتابیں لکھ کر اس کے اصول مقرر کرنے اور ان کی شاخیں نکالنے کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جنھیں ہم یہاں ختم کر ڈالنا نہیں چاہتے[1] +

[1] آنحضرت صلعم نے ایک ایسا بین الاقوامی قانون پیش کیا ہے کہ اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ مسلمان کارندوں کی بے اعتدالیاں اور بے قاعدگیاں اس قانون کو کمزور نہیں بنا سکتیں اور نہ مسلمانوں کی تاریخی غلطیوں سے یہ قانون متاثر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم جیسی حکمت کی کتاب پر جب تک پوری طرح دماغ صرف نہ کیا جائے اس کی پوری عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن عربی علم ادب میں ایک بے نظیر چیز ہے۔ لیکن یہ بات صرف عربی جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ غیر عرب قرآن کی اس خوبی کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان سے قرآن کی بڑائی منوانے کے لئے اس کے معنے سمجھانے پڑیں گے اور اس کے اندر جو حکمت ہے وہ ظاہر کرنی پڑے گی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور اس کے ساتھ بدور بازغہ اور خیر کثیر پڑھنے کے بعد ہم قرآن کی حکمت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ امام ولی اللہ دہلوی سے پہلے کسی فاضل نے اس فن پر کتاب لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ حجۃ اللہ البالغہ اسلامی ادبیات میں اس حیثیت سے بے نظیر چیز ہے کہ یہ اس فن پر پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کی عظمت یہ جاننے کے بعد اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے بعد بھی اب تک اس پلے کی کوئی کتاب لکھی نہیں گئی +

علمِ کلام میں شاہ صاحب کا مسلک

متکلمین سے اختلاف

آپ دیکھیں گے کہ جب میں اپنا مطلب بیان کرنے پر زور شور سے بحث اور قاعدے مقرر کرنے پر بڑے غور سے کلام کر رہا ہوں گا، اس وقت کبھی کبھی ایسی حالت بھی پیش آئے گی کہ میں بعض ایسے اصول مقرر کروں گا جنھیں علم کلام کے اکثر عالم اور مناظرہ کرنے والے نہیں مانتے۔ مثلاً:

(۱) مرنے کے بعد کی زندگی یعنی آخرت کی فضاؤں میں اللہ تعالےٰ کا صورت اور شکل کے ساتھ تجلّی کرنا +

(۲) کائنات میں ایک ایسا عالم (جہان) ماننا جو جسمانی عنصروں سے بنا ہوا نہیں ہے۔ اس میں معانی[۱] اور عمل[۲] مناسب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور جو جو واقعات اس مادی اور جسمانی دنیا میں پیش آنے والے ہوتے ہیں وہ پہلے اُس غیر مادی عالم میں پیدا ہو چکتے ہیں +

---

[۱] معانی سے مُراد وہ چیزیں ہیں جو ہمارے صرف ذہن میں آتی ہیں۔ مثلاً محبت، موت، نفرت وغیرہ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اِس عالم کی یہ غیر مادی چیزیں اُس عالَم کے حسب حال جسم اختیار کر لیتی ہے مثلاً علم اُس دُنیا میں دُودھ کی شکل میں نظر آتا ہے اور کنجوسی گنجے سانپ کی شکل اور صورت اختیار کر لیتی ہے +

[۲] اس غیر مادی دُنیا میں جس طرح معانی خاص خاص شکلیں اور صورتیں اختیار کر لیتے ہیں اُسی طرح ہم جو کام کرتے ہیں وہ بھی وہاں جاکر خاص خاص شکلیں اختیار کر لیتے ہیں +

(۳) انسان کے کرموں کا نتیجہ اور جوہر وہ چیز ہے جو انسان کے نفس کے اندر ایک خاص قسم کی کیفیت کی شکل میں جمع ہو جاتی ہے۔ یہی نفسانی کیفیتیں آگے چل کر انسان کے لئے جزا (اچھے بدلے) اور سزا (بُرے بدلے) کا سبب بنتی ہیں۔ یہ بدلہ چاہے اس زندگی میں مل جائے چاہے مرنے کے بعد کی زندگی میں +

(۴) قدر مُلزم کا مسئلہ[1] +

اسی طرح کے چند اور مسئلے بھی ہیں جنھیں ہم مانتے ہیں +

اس مسلک کی تاکید قرآن اور سنت سے	مَیں نے اِن باتوں کو ماننے کی اُس وقت تک جرأت نہیں کی جب تک مَیں نے یہ نہ دیکھ لیا کہ قرآن حکیم کی آیتیں

اور حضرت نبی اکرم صلعم کی حدیثیں، آپؐ کے صحابہ کے قول اور اُن کے شاگردوں کے خیالات ان مسئلوں کی پُوری پُوری تائید میں ہیں۔ مَیں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ اہل سنّت کے خاص عالم بھی جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے خاص علم دیا ہے ان مسئلوں کو مانتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے قاعدوں کی بنیاد انہی مسئلوں پر رکھتے ہیں اور "سنّت" ایک خاص جماعت کے نظریات کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اہل سنّت کے مسلک سے وہ مسئلے مُراد ہیں جو ان سب لوگوں

---

[1] تمام عالم، مادی ہو یا غیر مادی، ایک خاص نظام میں بندھا ہُوا ہے اور ایک خاص تدبیر اس کے اندر کام کر رہی ہے۔ اس کا کوئی ذرّہ اس نظام کے قانونوں سے باہر نہیں ہے اس مسئلے کا نام شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں قدر مُلزم ہے +

میں پائے جاتے ہیں جو اہل قبلہ ہیں یعنی ایک قبلے کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن ان میں ان مسئلوں کی ترجمانی کرنے میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے اور اس اختلاف کی وجہ سے وہ مختلف جماعتیں اور پارٹیاں بن گئی ہیں حالانکہ وہ دین کے ضروری مسئلوں میں ایک ہی رائے رکھتے ہیں +

اختلافی مسئلے | وہ اختلافی مسئلے دو قسم کے ہیں :-

(۱) ایسے مسئلے جو قرآن حکیم میں صاف صاف طور پر بیان ہوچکے ہیں۔ صحیح حدیثوں سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے اور صحابہ اور اُن کے شاگرد یعنی تابعین بھی اُن کے موافق چلے آئے ہیں +

جب دوسری صدی ہجری میں اختلاف پیدا ہوگیا اور ہر صاحب رائے نے اپنے ہم خیالوں کو جمع کرکے ایک جماعت بنالی تو اُن میں ایک جماعت ایسی بھی قائم ہوگئی جس نے اپنا عقیدہ یہ بنالیا کہ ہم قرآن حکیم اور رسول اللہ کی سنت کے صرف ظاہری معنی ماننے ہیں۔ اُنھوں نے سلف یعنی اپنے سے پہلے بزرگوں سے جن سے مُراد صحابہ اور تابعین ہیں، جو عقیدے بیان ہوتے چلے آئے ہیں فقط اُنھیں مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اِس بات کی پروا نہیں کرتے کہ یہ اصول عقلی طور پر ثابت ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس جماعت کے عالم اگر کبھی عقلی باتوں (معقولات) پر بحث بھی کرتے ہیں تو فقط اس لئے کہ اپنے مخالف کے اعتراض کا جواب دیں یا اعتراض سے جو شک پیدا ہوجاتا ہے اسے دُور کرکے اطمینان پیدا کرلیں۔ اُن کا مسلک یہ ہے کہ ان عقلی بحثوں سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں

کیا جاتا یہ جماعت اہلِ سنّت کہلاتی ہے +

ان کے مقابلے میں ایک اور جماعت ہے کہ انھیں جہاں گمان گزرا کہ قرآن اور حدیث کے لفظ عقلی اصول سے ٹکراتے ہیں وہ اُس "معقول" بات کو تو اپنے لئے اصل بنا لیتے ہیں اور قرآن اور حدیث کے لفظوں کے معنی پھیر دیتے ہیں یعنی ان کے ایسے معنی کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں "عقل کے مطابق" ہیں یہ لوگ جب کلام کرتے ہیں تو کسی بات کی تحقیق کرنے کے لئے یا اُسے واضح طور پر بیان کرنے کے لئے کرتے ہیں +

ان میں جن مسئلوں کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس قسم کے ہیں: قبر میں سوال جواب، عملوں کا تولا جانا، پُل صراط پر سے گزرنا، اللہ تعالیٰ کو "دیکھنا" اور اولیاء اللہ کی کرامتیں۔ یہ سب چیزیں اللہ کی کتاب (قرآن حکیم) اور رسول اللہ کی سنّت میں پائی جاتی ہیں اور کتاب و سنّت کے ظاہری الفاظ ان کی تائید میں ملتے ہیں سلف (یعنی صحابہ اور تابعین) کا مسلک ظاہر کے مطابق تھا۔ لیکن ہمارے یہ "معقول پسند" علماء کہتے ہیں کہ عقل ان چیزوں کو نہیں مان سکتی اس لئے بعض تو ان ظاہری لفظوں کی تاویل کر لیتے ہیں یعنی ان کے معنی ایسے کر لیتے ہیں جو ان کے نزدیک عقل مان سکتی ہے یا اُن کا انکار کر دیتے ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اگرچہ ہم اُن کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔ اور ہماری عقل اِن کی تائید نہیں کرتی +

شاہ صاحب کا مسلک | ہم کہتے ہیں کہ ہم یہ سب چیزیں اہلِ سنّت کے موافق مانتے ہیں

لیکن خدا تعالیٰ نے ہمیں سمجھ دی ہے اور ہم انھیں اچھی طرح سمجھ کر مانتے ہیں اور ہماری عقل ان کے صحیح ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ (گویا ہم عام اہلِ سنّت سے اس بارے میں ممتاز ہیں کہ وہ جن باتوں کی تاویل کرتے یا جن کا انکار کرتے ہیں یا جن کے بارے میں وہ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ ہم ان سب کو عقل کے ذریعے سمجھ کر مانتے ہیں) +

(۲) دوسرے مسائل جن میں اہلِ قبلہ کا اختلاف ہے وہ نہ تو قرآن حکیم میں آئے ہیں نہ حدیث میں۔ انھیں کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ نہ صحابہ نے ان میں کوئی بحث کی ہے نہ اس لمبے زمانے میں کسی نے انھیں کھولا ہے۔ ان کے بعد عالموں نے ان پر بحث کی تو ان میں سے کسی نے کچھ فیصلہ کیا اور کسی نے کچھ۔ اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ (ان مسئلوں میں ہمارے لئے ضروری نہیں ہے کہ جو فریق اپنے آپ کو "اہل سنت" کہتا ہے ہمیشہ اسی کی پیروی کریں) +

عالموں کے اختلافوں کے سبب | (الف) "اہل حدیث" نے نقلی دلائل[1] سے بعض مسئلے نکالے ہیں جیسے یہ مسئلہ کہ نبی فرشتوں سے بہتر ہوتا ہے۔ یا حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ سے زیادہ اونچے درجے کی ہیں +

---

[1] ایسی دلیلیں جن میں کسی چیز کے صحیح ہونے کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ فلاں علم کی رُو سے صحیح ہے بلکہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ فلاں مذہبی کتاب میں لکھا ہے مثلاً قرآن میں یُوں آیا ہے۔ یا حدیث یُوں کہتی ہے یا بائیبل یا "گرنتھ" میں یوں بیان کیا گیا ہے + (مرتب)

(ب) اہلِ سنت، جن مسئلوں کو سُنّت کے موافق سمجھتے ہیں انھیں اُن اصول پر موقوف مانتے ہیں۔ مثلاً بعض عام استعمال کے مسئلے اور کچھ جوہر اور عرض (یعنی مادی اور غیر مادی چیزوں) کی بحثیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عالم کا حادث[1] ہونا ہیولیٰ[2] کے باطل ثابت کرنے اور جزء لایتجزیٰ[3] کے ثابت کرنے پر موقوف ہے۔ ایسے ہی یہ مسئلہ ثابت کرنا کہ اللہ تعالےٰ نے اس عالم کو بلا کسی واسطے اور ذریعے کے پیدا کیا ہے اس مسئلے کے باطل کرنے پر موقوف ہے۔ کہ ایک سے صرف ایک ہی چیز پیدا یا صادر ہوسکتی ہے۔ اسی طرح معجزے بھی ثابت کئے جاسکتے ہیں کہ پہلے یہ ثابت کرلیا جائے کہ علت اور معلول یا سبب یا مسبب میں کوئی ضروری تعلق نہیں ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں سبب ہوگا وہاں مسبّب ضرور ہوگا یا جہاں علت ہوگی وہاں اس کا معلول ضرور ہوگا (جیسے جہاں آگ ہوگی وہاں گرمی ضرور ہوگی۔ اس میں آگ سبب یا علت ہے اور گرمی مسبّب یا معلول ہے) ایسے ہی مرنے کے بعد کی زندگی میں جسموں کے ساتھ اُٹھنا اس بات پر موقوف ہے کہ یہ ثابت کردیا جائے کہ جو چیز معدوم یا فنا ہوجائے وہ پھر سے لوٹ سکتی ہے ۔

---

[1] حادث ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز ایک وقت نہیں تھی پھر ہوگئی ظاہر ہے کہ ایسی چیز ضرور اس بات کی محتاج ہے کہ کوئی اسے وجود میں لائے ایسی چیز کو حادث کہتے ہیں۔

[2] ہر شئے کی اصل

[3] مادے کا آخری ذرہ جو آگے تقسیم نہیں ہوسکتا۔ اسے آجکل سالمہ (Atom) کہتے ہیں۔

اس قسم کے اختلافی مسئلے ہیں جن سے اُن کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ (ان میں بھی شاہ صاحبؒ کیلئے ضروری نہیں ہے کہ جن مسئلوں کے ثابت کرنے پر وہ اپنے عقیدوں کی بنیاد رکھتے ہیں ان مسئلوں کو اسی طرح مان لیں جس طرح یہ عالم مانتے ہیں) +

(ج) قرآن یا حدیث میں ایک چیز صاف لفظوں میں نہیں آئی۔ اُس کی شرح کرنے میں اہل سنّت اور ان کے مقابل فریق میں اختلاف ہوگیا۔ گو اصل مسئلوں کو دونوں مانتے ہیں جیسے :-

(۱) سب مانتے ہیں کہ اللہ سُنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔ غیر اہلِ سنّت کہتے ہیں کہ دونوں صفتیں اللہ تعالےٰ کے علم کا حصہ ہیں اور اہلِ سنّت کہتے ہیں کہ نہیں یہ مستقل صفتیں ہیں +

(۲) دونوں فریق مانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ زندہ، جاننے والا، ارادہ کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے اور بولتا ہے پھر ایک فریق کہتا ہے کہ ان سے وہ کام اور نتیجے مراد ہیں جو ان سے اللہ تعالےٰ کو حاصل ہوتے ہیں اور ان صفتوں میں اور اللہ تعالےٰ کی رحمت، غضب اور سخاوت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرا گروہ (اہل سنّت) کہتا ہے کہ یہ اللہ کی صفتیں ہیں ان کا علیحدہ علیحدہ وجود ہے اور یہ اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں +

(۳) اسی طرح دونوں گروہ متفق ہیں کہ اللہ تعالےٰ عرش پر ہے اس کا مُنہ ہے وہ ہنستا بھی ہے۔ اس کے بعد ایک فریق کہتا ہے کہ ان سے ایسے

معنی مراد لینے چاہئیں جو اللہ تعالےٰ کی ذات کے مناسب ہوں۔ مثلاً عرش پر ہونے سے مراد اُس کا غلبہ ہے۔ "وجہ" سے مراد ذات ہے۔ دوسری جماعت (اہل سنت) اس مشکل کو تہ کر کے رکھ دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتی ہے۔ کہ ہم نہیں جانتے کہ ان لفظوں سے کیا مُراد ہے۔

امام صاحب کا مسلک | ان مسئلوں میں کون صحیح ہے؟ مَیں اس کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہتا کہ فلاں سنّت پر ہے اور فلاں سنّت پر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اصل سنّت کا خیال کیا جائے تو وہ یہ ہے۔ کہ ان باتوں پر سرے سے بحث ہی نہ کی جاتے۔ جیسے صحابہ اور تابعین نے ان پر بحث ہی نہیں کی۔ لیکن جب بحث کی ضرورت پڑی تو بحث کرنی پڑی۔ اب ہماری رائے یہ ہے کہ اہل سنّت نے جو باتیں کتاب اور سنّت میں سے نکالی اور سمجھی ہیں وہ سب کی سب صحیح یا دوسرے فریق کی باتوں سے بہتر نہیں ہیں۔ ایسے ہی ان لوگوں نے جس بات کو دوسری بات پر موقوف سمجھا ہے ضروری نہیں کہ وہ اُس طرح موقوف ہو۔ اسی طرح جس چیز کو ان لوگوں نے غلط قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اسے غلط کہنا ضروری نہیں ہے۔ یا جس چیز کو انھوں نے مشکل سمجھ کر اس پر بحث نہیں کی ہمارے نزدیک وہ اصل میں مشکل نہیں ہے ایسے ہی قرآن حکیم کی آیتوں اور رسول اللہ صلعم کی حدیثوں کی ان اہل سنّت نے جو تشریح کی ہے ہمارے نزدیک ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی تفسیر اور تشریح

سب سے بہتر ہو خلاصہ یہ کہ انسان کا سُنّی[1] ہونا پہلی قسم کے مسئلوں کے ماننے پر موقوف ہے دُوسری قسم کے مسئلوں کو ماننا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ سُنّی عالم جیسے اشاعرہ[2] اور ماتریدیہ[3] دوسری قسم کے بہت سے مسئلوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور ہر زمانے کے بڑے بڑے عالم ایسی باریک باتیں جو سُنّت کے خلاف نہیں ہیں پیش کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ اُن سے پہلے لوگوں نے وہ بات نہیں کہی +

فقہ میں امام صاحبؒ کا مسلک

تحقیقی مسلک جن مسئلوں پر ہم بحث کریں گے اُن میں اوپر بیان کئے ہوئے عالموں نے آپس میں بہت اختلاف کیا ہے۔ ہم ان اختلافات کے چھوٹے چھوٹے تنگ راستوں پر نہیں چلیں گے بلکہ تحقیق کی شاہراہ اختیار کریں گے۔ جس پر اسلام کے مرکزی لوگ چلتے رہے ہیں اور جڑوں کو چھوڑ کر شاخوں میں ہاتھ نہیں اُلجھائیں گے +

بات یہ ہے کہ ہر ایک علم کی حدیں ہوتی ہیں اور ہر موقع کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ایک علم پر بحث کرتے کرتے دوسرے کی

---

[1] جو لوگ نبی اکرم صلعم کی سنت کو اپنی زندگی کا طریقہ بناتے ہیں وہ سُنّی کہلاتے ہیں +

[2] ابوالحسن اشعریؒ (وفات ۳۲۴ھ) کے پیرو اشاعرہ کہلاتے ہیں +

[3] ابوالمنصور ماتریدی (وفات ۳۳۳ھ) کے پیرو ماتریدی کہلاتے ہیں۔ ماتریدایک قصبے کا نام ہے +

باتیں لے بیٹھیں۔ ایسے ہی جو شخص اسرار دین کے علم پر بحث کرے اُس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اُن اختلافات میں سے کسی پر غور کرنے لگ جائے۔ علم اسرارِ دین پر بحث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بتایا جائے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام دئے ہیں ان میں کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اب وہ حکم ہمیشہ کے لئے تھے یا کچھ عرصے کے لئے (اور بعد میں وہ واپس لے لئے گئے یعنی منسوخ کر دئے گئے) اُس کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک علم پر بحث کرنے والا آدمی اُس علم کے لحاظ سے سب سے صحیح بات کو لے کر اُس پر بحث کرے گا۔ علمِ اسرارِ دین پر بحث کرنے والے کو چونکہ حدیث سے سیدھا تعلق ہے اِس لئے وہ حدیثوں میں سے جو سب سے زیادہ صحیح حدیث ثابت ہوگی اُسی کی حکمتیں بتائے گا۔ حدیث کے فن کے لحاظ سے حق کے قریب وہ حدیثیں ہیں جو دوسری صدی ہجری میں علیحدہ کر کے جمع کر لی گئیں۔ اُس زمانے تک تمام مرکزی شہروں کی حدیثیں جمع ہو چکی تھیں اور ساتھ ہی قانون دانوں (فقہا) کے فتوے (فیصلے) بھی جمع ہو چکے تھے۔ ان سب روایتوں کی چھان بین کر کے اُن روایتوں کو جن کے بیان کرنے والے ایک ایک دو دو سے زیادہ نہیں تھے انھیں علیحدہ کر دیا گیا ❖

اس کے ساتھ ہی اگر کسی جگہ کسی فقیہ (قانون دان) کی رائے پر بحث ہوگی تو وہ فقط ضمنی طور پر ہوگی اور اگر ہم کسی جگہ کسی عالم کے فیصلے کو دوسرے عالم کے فیصلے

سے بہتر کہہ دیں تو یہ عالموں کے درجے سے گری ہوئی بات نہیں ہوگی اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس عالم کی رائے کو ہم نے دوسرے درجے کا سمجھا وہ خدانخواستہ بُرا ہے۔ اِن اُرِیْدُ اِلَّا الاِصلاحَ مَا استطعتُ؛ وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلتُ والیہ انیب (میں تو جہاں تک ہو سکے اصلاح کرنی چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں اللہ ہی سے توفیق مانگتا ہوں۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا ہوا ہے اور ہر مشکل میں اسی کی طرف لوٹتا ہوں) +

میں کسی ایسی بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اللہ کی کتاب اور صحیح سنت کے خلاف ہو یا اُن زمانوں کے عالموں کے متفقہ خیالات کے خلاف ہو جن کے اچھا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اگر خدانخواستہ میری کتاب میں کوئی ایسی بات آ گئی ہو تو وہ غلط ہی قرار دی جائے۔ باقی رہے وہ لوگ جو پرانے بزرگوں کے کلام سے نئے نئے مسئلے نکالتے ہیں اور پھر جھگڑے پر اُتر آتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری نہیں ہے کہ ان کی ہر ایک بات کو مان لیں۔ بات یہ ہے کہ اگر وہ اس راہ کے مرد ہیں تو ہم بھی تحقیق کے شہسوار ہیں۔ اس لئے ہم اور وہ برابر ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ ہر بات میں اُن کی پیروی کریں +

کتاب کے مضامین کی تقسیم

ہم نے اس کتاب کو دو حصّوں پر تقسیم کیا ہے :-

پہلا حصہ اُن کلی قاعدوں کے بیان میں ہے جن سے شرعی حکموں کے اندر پوشیدہ حکمتیں اور مصلحتیں منتظم ہوتی ہیں +

آنحضرت صلعم کے مبارک زمانے میں جو دین موجود تھے (مثلاً عیسائیت یہودیت وغیرہ) اُن سب میں وہ حکمتیں مانی جاتی تھیں اور اُن میں اِس بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لئے اِن مذہبوں کو عام طور پر جاننے والے سمجھدار لوگ جو آنحضرت صلعم کے پاس حاضر رہتے تھے۔ اُن باتوں کے متعلق آپؐ سے پوچھنے کے محتاج نہیں تھے۔ (مثلاً تمام مذہبوں میں خدا کی ہستی مانی جاتی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اسکی عبادت بھی ضروری ہے اِس لئے اس کے متعلق اُنھیں پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی) لیکن جب آپؐ نے اُن قاعدوں کے ماتحت دوسرے درجے کے قانون (بائی لاز) بنانے شروع کئے تو آپؐ نے اس اصل قاعدے کی طرف بھی توجہ دلادی جس کے ماتحت آپ حکم دے رہے تھے (مثلاً اللہ کی عبادت ہر دین میں فرض ہے۔ جب آپؐ نے اس بنیادی قاعدے کے ماتحت نماز کی تاکید فرمائی تو اس اصل قاعدے کی طرف بھی پوری طرح توجہ دلادی) سُننے والے اُس ضمنی قاعدے کو اصل قانون کے ماتحت لاسکتے تھے +

مَیں نے ان قاعدوں کو منتظم کرنے میں پھر دو باب بنا دیے ہیں:

پہلے باب میں اس بات پر بحث ہے کہ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے قانون میں "نیکی" اور "بدی" کا کیا مطلب ہے؟ اسے ہم نے "بِر" (نیکی) اور "اِثم"

"اثم" (بدی) کے نام سے لکھا ہے۔ دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ جماعتوں کو اس قانون کے نیچے کیسے منظم کیا جاتا ہے۔ اسے سیاست ملّی (Super-national Politics) کہتے ہیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ جب تک یہ تین بحثیں مکمل نہ ہولیں برّ (نیکی) اور اثم (بدی) کی حقیقت بیان کرنا آسان نہیں ہے :-

(۱) انسان کو اس کے کرموں کا اچھا یا برا پھل اس دنیا میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں کس طرح ملتا ہے ؟

(۲) انسانی جماعتیں اپنی معاشی ضرورتیں کس طرح جمع کرتی ہیں اور اس کے لئے گاؤں اور شہر کس طرح بساتی ہیں، اس بحث کی سرخی ہم نے "ارتفاقات" رکھی ہے +

(۳) انسان ہونے کی حیثیت سے انسان کی وہ کیا ضرورت یا خواہش ہے جس کے پورا ہونے کے بعد وہ سمجھے کہ میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ ہمارے نزدیک اس بحث کا عنوان (سرخی) ہے۔ "سعادتِ نوعی" (وہ انتہائی بھلائی جس کا تعلق ساری نوعِ انسانی کے ساتھ ہے) +

یہ تین بحثیں اصل میں فلسفہ الٰہی[۱] کی چند بحثوں پر موقوف ہیں اس

[۱] وہ حکمت اور فلسفہ جس کا تعلق اللہ تعالےٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ مثلاً ان سوالوں کا جواب کہ یہ کائنات اللہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے ؟ یہ کائنات "اس میں" سے پیدا ہوئی ہے یا اس سے الگ ہے ؟ وغیرہ وغیرہ +

لئے ہم ان مسئلوں کا صرف سرسری ذکر کریں گے لیکن ان میں دلیلیں بیان نہیں کریں گے۔ اب اس کتاب کے پڑھنے والے کا اختیار ہے کہ یا تو ان باتوں کو اس لئے مان لے کہ ان پر سب دینوں کا اتفاق ہے یا مصنف پر بھروسہ کرکے مان لے یا اس بھروسے پر مان لے کہ انکی دلیلوں کا ذکر اس سے اعلےٰ اور مفصل علم میں آگے چل کر آجائے گا۔ [1] چنانچہ مَیں نے اس بات پر بحث نہیں کی کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ روح موجود ہے اور وہ موت کے بعد باقی رہتی ہے اور جسم چھوڑنے کے بعد اُسے عذاب یا آرام ملتا ہے۔ اس لیے کہ اُن باتوں کے متعلق عام مذہبی بحث کی کتابوں میں ذکر آتا ہے۔ مَیں نے فقط وہ مسئلے لیے ہیں جن کا ذکر اُن کتابوں میں نہیں آتا اور میں نے قرآن و حدیث سے بھی زیادہ دلیلیں لانے کی کوشش نہیں کی۔ غرض

(۱) سب سے پہلے وہ باتیں آئیں گی جنھیں شروع میں ریاضی کے اُصول کی طرح مان لینا پڑتا ہے +

(۲) اس کے بعد یہ بحث ہوگی کہ انسان کو مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد کرموں کا پھل کیوں ملتا ہے +

(۳) اس کے بعد ارتفاقات پر بحث ہوگی جو تمام انسانوں کے لئے طبعی ہیں جن کو ہر قوم نے ضروری خیال کیا ہے +

(۴) پھر انسان کی سعادت (طبعی نیکی) اور شقاوت (طبعی برائی) پر بحث

[1] امام صاحبؒ نے اس اعلیٰ علم پر اپنی کتاب خیر کثیر لکھی ہے +

ہوگی جس میں انفرادی نقطۂ نگاہ کی بجائے نوعی نقطۂ نگاہ کو اختیار کیا جائے گا +

(۵) پھر وہ نیکیاں اور بدیاں بیان کی جائیں گی۔ جنھیں تمام دینوں کے لوگ برابر مانتے ہیں +

(۶) پھر بیان کیا جائے گا کہ بین الاقوامی سیاست میں فوجداری اور دیوانی قانون کس کس قاعدے پر بنانے چاہئیں +

(۷) اس کے بعد بتایا جائے گا کہ آنحضرت صلعم کے کلام سے قانون نکالنے کے کیا اصول ہیں +

دُوسرے حصے میں ہم نے صحیح حدیثوں کی حکمت کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے باب مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) ایمان وعلم

(۲) پاکیزگی

(۳) زکوٰۃ ونماز

(۴) روزہ

(۵) حج

(۶) احسان (تصوف)

(۷) معاملات

(۸) تدبیرِ منزل (خانہ داری)

(۹) سیاستِ مدن (شہروں کا انتظام)

(۱۰) آدابِ معیشت

(۱۱) متفرقات

اب ہم اصل کتاب شروع کرتے ہیں ✧

ہم خدا کی تعریف کرتے ہیں، شروع میں اور آخر میں:

پہلا حصہ

اُن کلی قاعدوں کا بیان جن سے وہ مصلحتیں سمجھ
میں آتی ہیں جو شرعی حکموں میں رکھی گئی ہیں ؞
(اس میں سات مبحث ہیں جن کے ستر باب ہیں)

پہلا مبحث

انسانی ذِمّہ داری اور انسان کے عملوں کی جزا کے اسباب

پہلا باب (۱)

اِبداع، خَلق اور تدبیر کی تشریح

پہلا مبحث

انسانی ذمّہ داری اور انسان کے عملوں کی جزا کے اسباب

پہلا باب (۱)

ابداع، خلق اور تدبیر کی تشریح

امام صاحبؒ کے فلسفے کا خلاصہ

اس سے پہلے کہ ہم اصل کتاب شروع کریں کتاب کے مصنف، امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کا خلاصہ درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ اُن مسئلوں کے سمجھنے میں جو اس کتاب میں آئے ہیں آسانی ہو۔

امام ولی اللہ کا فلسفہ کسی پہلے فلسفی کے تمام حصّوں سے سارے کا سارا نہیں ملتا۔ اُن کی بہت سی چیزیں یونان کے افلاطونی فلاسفروں سے ملتی ہیں۔ کچھ حصّہ ارسطو کا فلسفہ جاننے والے لوگوں سے ملتا ہے۔ اس کے بعد اسلامی دَور میں جتنے صوفی فلاسفر گزرے ہیں، جیسے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ، ان سے بہت سی چیزیں ملتی ہیں۔ اِن کے بعد چند مسئلوں میں امام ولی اللہ کی اپنی خاص رائیں ہیں۔ جن سے یہ فلسفہ نبیوں کی شریعتوں کے حل کرنے کے لئے زیادہ موزوں بن جاتا ہے۔ اِس پر اُنھوں نے پانچ چھ کتابیں لکھی ہیں۔ وہ اپنے خاص نظریات بیان کرتے وقت کبھی "الف" سے شروع کر لیتے ہیں کبھی "یے" سے اور ایک ہی چیز ایک کتاب میں ایک نام سے بیان کرتے ہیں دوسری کتاب میں دوسرے نام سے۔ اس وجہ سے اُن کی باتوں کو سمجھنا کسی قدر مشکل ہو جاتا ہے۔

امام صاحبؒ کے بعد اُن کے سب علموں کے ماہر اُن کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ ہوتے ہیں ایسے ہی شاہ عبدالعزیزؒ کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدینؒ بھی امام صاحبؒ کے خاص ماہر ہوتے ہیں۔ ان دو بزرگوں کی شاگردی سے دہلی میں عالموں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہو گئی۔ جس نے افلاطون[1]، ارسطو[2]، شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی

---

[1] افلاطون: ۴۲۷ تا ۳۴۷ قبل مسیح [2] ارسطو: ۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح

اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ[1] کے فلسفے پر پوری نظر ڈالی اور پھر امام صاحبؒ کے علموں کے پورے ماہر ہو گئے۔ اُن عالموں میں سے جو اِن دونوں بزرگوں نے پیدا کئے۔ امام صاحبؒ کے پوتے مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ[2] ہیں انھوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ اُس کا نام عَبَقَات ہے۔ اُس میں اُنھوں نے شاہ صاحبؒ کے خاص فلسفے کو کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور شاہ صاحب ایک ہی چیز کے جو مختلف نام اپنی مختلف کتابوں میں لائے ہیں اُنھیں ایک جگہ جمع کر کے دکھا دیا ہے کہ کس چیز سے کیا مُراد ہے۔ ہم اِس کتاب (عبقات) کے بعض حصّوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ زیادہ مطالعے کے لئے اصل کتاب پڑھنی چاہیے:۔

جسمانی عالم کو جتنا بھی لمبا چوڑا سمجھا جائے۔ اُسے ایک ہی جسم ماننا چاہئے۔ یہ سارا جسم خود ایک مستقل چیز ہے اور اُس کے اندر مختلف جسم ایسے ہیں جیسے سمندر کی مَوجیں۔ اس سارے جسم میں ایک خاص طبعی تقاضا کرنے والی قوت ہے جو تمام اجزاء کو انکی اپنی اپنی مناسب شکلوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے +

---

[1] شیخ محی الدین ابن عربی۔ پیدائش سنہ وفات سنہ

[2] مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ۔ پیدائش ۱۷۷۹ء شہادت ۱۸۳۱ء

جسم کا ایک حصہ ہے جو ایک وقت میں عناصرؔ کی شکل رکھتا تھا۔ پھر اُس نے جڑی بوٹی وغیرہ "نباتات" کی شکل اختیار کر لی پھر اس نے حیوانی شکل اختیار کر لی۔ غرض اس جسم کے مختلف اجزاء جو مختلف شکلیں بدلتے رہتے ہیں۔ اُن سب کی مرکزی قوت اس بڑے جسم کے اندر محفوظ ہے۔ اس مرکزی قوت کو اصطلاح میں "طبیعت الکل" (The Universal Temperament) کہتے ہیں اور اس بڑے جسم کو مع اُس کی تمام قوتوں کے شخصِ اکبر (Universum Permagum) کہا جاتا ہے۔ جیسے ہر ایک انسان میں رُوح ہے جو اُس کے علم اور ارادے کی مالک ہے۔ ویسے ہی اس بڑے جسم یا "شخصِ اکبر" کی ایک روح مان لی جائے۔ اُسے "نفس الکل" .. - - - - - - - (Universal Soul) کہا جاتا ہے۔ مختلف جسموں میں جس قدر چھوٹی چھوٹی روحیں ہیں اُن سب کو اس بڑی رُوح سے وہی نسبت ہے جو انسان کی سُننے دیکھنے سوچنے وغیرہ کی قوتوں کو انسان کی روح سے ہے۔ یہ بڑی روح چھوٹی روحوں پر حاکم ہے۔ جس طرح چھوٹے سے چھوٹے کیڑے میں خیال کی قوت ہے، اُسی طرح "شخصِ اکبر" کی بہت بڑی قوتِ خیال ہے

لہ عناصر جمع ہے عُنصر کی عنصر مادے کی وہ غیر مرکب شکل ہے جس سے تمام مرکب چیزیں بنی ہیں۔ جیسے ہائیڈروجن گیس۔ لوہا۔ پارہ وغیرہ +

اس کا نام عالمِ مثال ہے۔ اس "شخصِ اکبر" کی ایک بہت بڑی قوتِ ارادی بھی ہے۔ تمام دُنیا میں جتنے ارادے اور اُن کے متعلق کام کرنے والے اعضاء ملتے ہیں وہ سب اس بڑی قوتِ ارادی کے لشکر ہیں +

"شخصِ اکبر" کی قوتِ ارادی کا جس حصے سے زیادہ تعلق ہے اسے "شخصِ اکبر" کا "قلب" (Mind) کہتے ہیں۔ وہی "نفسِ کل" (Universal Soul) کا عرش (تخت) ہے۔ وہی "نفسِ کل" کا مرکز (تخت) بھی ہے۔ اس نفس کی تمام جسم پر حکومت ہے +

"شخصِ اکبر" کا قلب آئینے کی طرح سمجھنا چاہئے۔ اس میں "شخصِ اکبر" کے پیدا کرنے والے کا ہر ایک عکس پڑتا ہے۔ جس سے وہ اپنے رب کو پہچانتا ہے اس طرح طبعی طور پر اس کے "دماغ" میں اپنے رب کی ایک "صورت" پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت کا نام "تجلی اعظم" (Repercussus Permagnum) ہے۔ پھر اس تجلی اعظم کا عکس اس کے "قلب" پر بھی پڑتا ہے۔ اس کا نام بھی تجلی اعظم ہے +

انسانی جماعت نے جس قدر بھی ترقی کی ہے خواہ انبیاء کی رہنمائی میں کی ہے یا فلسفیوں کی رہنمائی میں وہ خدا کا اس سے

زیادہ تصور پیدا نہیں کر سکتی جس قدر "شخصِ اکبر" کے دماغ میں تجلیٔ اعظم ہے۔ یعنی ان کی ترقی صرف اس تجلی کے تصور تک پہنچ سکتی ہے۔ انسان کے جتنے ارادے، حرکتیں اور کام ہیں اُن کا مرکز اسی تجلی کو قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح جتنے کام ایسے ہیں جنھیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اُن کا وہ آخری نقطہ جہاں سے وہ صادر ہوتے ہیں اور جسے ہم تصور میں لا سکتے ہیں وہ بھی تجلیٔ اعظم ہے جو "شخصِ اکبر" کے قلب پر پڑ رہی ہے۔ "شخصِ اکبر" کے پیدا کرنے والے پر "اللہ" کا جو لفظ بولا جاتا ہے۔ وہ انسانی تخیّل کے مطابق اسی تصور یعنی "تجلی اعظم" کو دیا جاتا ہے +

پہلی "تجلی اعظم" جو "شخصِ اکبر" کے دماغ پر پڑتی ہے "غیب" کہلاتی ہے۔ (یعنی لوگوں کی نظروں سے چھپی ہوتی) دوسری تجلی اعظم جو "شخص اکبر" کے "دماغ" سے "شخص اکبر" کے "قلب" پر پڑتی ہے، وہ تجلی ہے، جس میں انسان قیامت کے روز اپنے ربّ کو دیکھیگا +

ذاتِ الٰہی اپنے تمام کمالات سمیت "شخصِ اکبر" سے علیحدہ حقیقت ہے۔ اسے ہمیشہ "غیب الغیب" یا "ذاتِ بحت" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ تجلی کی نسبت اپنے اصل سے ویسی ہی ہے جیسے عینک خود دیکھنے کا ذریعہ یا واسطہ ہے +

تجلی کا پورا مطلب سمجھنے کے لئے ایک اور مثال بھی دی جا سکتی

ہے۔ ہم زید کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے زید کو دیکھا۔ حالانکہ اصل میں ہم نے اُس کے بدن کو دیکھا ہے۔ اس کا بدن اُس کی رُوح کی تجلّی ہے۔ تمام معاملات جو انسان کی رُوح سے کرنے منظور ہوتے ہیں وہ سب کے سب انسان کے بدن کے ساتھ کئے جاتے ہیں اور ہم پورا یقین رکھتے ہیں کہ یہ معاملات اصل میں اُس کی رُوح کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ جب تک انسان کے بدن کو اُس کی رُوح سے الگ یا غیر خیال نہیں جائے گا وہ اُس انسان کی رُوح کی تجلّی کہلائے گا اور جب اسے مستقل توجّہ سے دیکھا جائے گا، اور اُس کا رُوح کے ساتھ جو تعلّق ہے کہ وہ اُس سے کام لے رہی ہے اور اپنے آپ کو اس کے ذریعے سے ظاہر کر رہی ہے، بھلا دیا جائیگا تو اُسے رُوح کی تجلّی نہیں کہا جائے گا۔

انسان کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ بدن اس سے رنگین ہو کر (اثر لے کر) کام پورا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خیال انسان کے دماغ کے اندر پختہ شکل میں مضبوطی کے ساتھ جگہ پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح انسان کا دماغ پہلی سطح سے ذرا ترقی کر جاتا ہے۔ اب یہ ترقی دوسرا قدم بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ اس پختہ خیال سے ایک خیال پیدا ہونے لگتا ہے جو پہلے خیال کی بہ نسبت زیادہ قوی اور زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ انسان کا بدن پہلے کی

طرح اِس سے بھی اثر لیتا ہے اور کام کرتا ہے۔ اِس کے نتیجے کے طور پر انسان کا دماغ ایک خاص اثر لیتا ہے اور اُس کی پختگی میں ایک نمبر اَور بڑھ جاتا ہے۔ موت تک اسی طرح ترقی جاری رہتی ہے +

اب انسان کے دماغ کو انسان کی رُوح کے لئے ایک تجلّی گاہ مان لیجئے اور یُوں کہئے کہ انسان کے دماغ میں جو خیال آتا ہے وہ انسان کی رُوح کی ایک تجلّی ہوتی ہے۔ انسان ان روحانی تجلیات کے ایک دوسرے کے پیچھے لگاتار دماغ میں آنے سے ترقّی کرتا ہے۔ اس ترقّی کا حاصل ایک دَورہ ہے۔ ایک خیال بیج کے طور پر دماغ میں سے نکلتا ہے۔ اور جسم کی زمین میں پھلتا پھُولتا ہے اور پھر دماغ اُس کا حاصل یا خلاصہ ایک نئے تجربے کی شکل میں وصول کر لیتا ہے اور رُوح ایک نیا قدم اُٹھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے +

اِسی طرح تجلّی اعظم کا رنگ تمام "شخصِ اکبر" کو رنگین کر دیتا ہے اور اس کا حاصل پھر تجلّیٔ اعظم کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس سے نئی تجلّی کے ظہور کا سامان بن جاتا ہے ان تجلّیوں کے تجدّد (یعنی نئی نئی تجلّیوں کے پیدا ہونے) سے اللہ تعالےٰ کی صفات پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اس سے فلسفۂ الٰہی میں کبھی بحث نہیں ہو سکتی اور نہ انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان تجلّیوں کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کہاں

ختم ہوگا۔ اس فلسفے کی انتہائی ترقّی یہ ہے۔ کہ تجلّی الٰہی کی شان کے ایک دَورے کو بیچ میں سے شروع کرکے اُس دَورے کے تمام رنگ کو سمجھ کر آخر تک پہنچادے ۔

"شخص اکبر" کیسے ظاہر ہُوا؟ اس کے متعلّق مفصّل علم انسان کی عقل میں نہیں آسکتا۔ اور نہ کوئی انسانی زبان ان حقیقتوں کو اصلی شکل میں بتاسکتی ہے۔ لیکن دھندلی سی شکل میں اِس سوال کے جواب کا خاکہ یُوں کھینچا جاسکتا ہے کہ ایک چٹیل میدان ہے جس میں سبزی کا نام ونشان نہیں ہے۔ یکایک اس میدان پر مینہ پڑتا ہے۔ جس سے وہاں قسم قسم کی سبزیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس تمام ترقی کا مدار مینہ پر ہے۔ اسی طرح "شخصِ اکبر" کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ پہلے پانی تھا پھر اس میں اللہ تعالےٰ کی تجلّیوں نے نئے اثر پیدا کئے اور قسم قسم کے جسم پیدا کردیئے، زمین، ستارے، ہوا، بجلی، گرمی وغیرہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر کام کرنے لگ گئیں۔ گویا جس طرح مینہ برسنے سے باغ میں طرح طرح کے پھول پھل نکل پڑتے ہیں اُسی طرح اللہ کی رحمت کے ایک خ[illegible]ں اثر سے "شخصِ اکبر" میں مختلف قسم کی قوتیں پیدا کردیں۔ اور جس طرح مختلف پھول اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک تناسب اور خوبصورتی پیدا کردیتے ہیں۔ اسی طرح "شخصِ اکبر" کی مختلف قوتیں مل کر ایک

خاص تناسب اور خوبصورتی کے ساتھ کام کر رہی ہے +

"شخص اکبر" کی پیدائش کے لئے کوئی مادہ تجویز کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ یہ خدا کے ایک ارادے یا حکم کی پیداوار ہے جسے ترقی دیکر "شخص اکبر" مکمل کر دیا گیا ہے۔ بغیر مادے کے فقط حکم سے پیدا کرنیکا نام اِبْدَاع ہے +

اگرچہ ہم "شخص اکبر" کی پیدائش کے متعلق مادہ معیّن کرکے نہیں دکھا سکتے لیکن اُس کے سوا جو اور چیزیں ہیں وہ اُس مادے سے پیدا ہوئی ہیں جو "شخص اکبر" کے اندر موجود ہے اُن کی حالت "شخص اکبر" کی سی نہیں ہے کہ اُن کے لئے مادے کی ضرورت نہ ہو۔ جو چیز اُس مادے سے پیدا ہو جو پہلے سے موجود ہے اُس کی پیدائش کا نام خَلْق ہے +

جب ایک مخلوق کے ساتھ بہت سی اور مخلوقات جمع ہوں تو اُن کے باہمی ربط کو قائم رکھنے کے لئے اُن میں سے ہر ایک کا صحیح مقام مقرر کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ہر چیز کا صحیح درجہ مقرر کرکے اُن سے کام لینے کا نام تَدْبِیْر ہے +

جب تَدْبِیْر مکمل شکل میں مرتّب ہو جائے یعنی "شخص اکبر" کا ایک چھوٹا سا نمونہ بن جائے تو اس کے قلب پر بھی تجلّیٔ اعظم کا ایک عکس آتا ہے۔ اُسے تَدَلّی کہا جاتا ہے +

ان چاروں کمالاتِ الٰہیہ یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تدلّی

کو پوری طرح شرح کے ساتھ بیان کرنا، امام ولی اللہؒ کے فلسفے کا خاص حصہ ہے۔ پہلے کسی فلسفی نے اسے یوں کھول کر پوری طرح بیان نہیں کیا۔ اگر مخلوقات کے فلسفے پر اس طرح ترتیب کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو اس سے جو فکر پیدا ہوتا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے بیان سے زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ توریت کا بیان ہو یا قرآن کا، یا ہند اور ایران کے مذہبوں کی مقدس کتابوں کا، اس طرح بیان کرنے سے شاہ صاحب کا فلسفہ اُن سب کے مطابق نظر آتا ہے +

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِس عالم کو وجود میں لانے کے لحاظ سے اسکی تین صفتیں، ایک دوسرے کے بعد آنے والی ماننی چاہئیں

۱- اِبداع: ایک چیز کو بغیر کسی چیز کے پیدا کرنا یعنی پہلے کوئی چیز نہیں تھی پھر ایک چیز پیدا کر دینا ابداع کہلاتا ہے۔ گویا ایک چیز کو عدم سے بغیر کسی مادے کے پیدا کرنا (یونانی حکماء اسے جَعْلِ بسیط کہتے ہیں افلاطون اس کا قائل ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا گیا کہ یہ امر یعنی مخلوقات کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ ہی تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی[1] +

---

[1] لفظ اللہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات، اُس کی صفات اور نام سبکے سب آجاتے ہیں۔ اگر اللہ کے ساتھ کوئی دوسری چیز ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا الگ منبع ہوگا۔ اس صورت میں گویا وہ اللہ سے پہلے موجود تھی اس لئے یہ کہنا کہ اللہ سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اجنبی چیز نہیں تھی تنہا اللہ تعالےٰ ہی تھا +

۲۔ خَلق: یہ ایک چیز سے دوسری چیز کے پیدا کرنے کا نام ہے جیسے آدمؑ کو مٹی سے بنایا اور جنّوں (یعنی نظر نہ آنے والی مخلوق) کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

ہر چیز کا ایک طبعی خاصّہ ہے | یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اِس دُنیا میں جو جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ مختلف نوع اور جنس کی ہیں اور ہر ایک نوع اور ہر ایک جنس کا الگ الگ خاصّہ ہے مثلاً انسانی نوع کا یہ خاصّہ ہے کہ سوچ کر بات کرے، اُس کے بدن پر لمبے لمبے بال نہ ہوں، قد سیدھا ہو۔ ایک دوسرے کی بات سمجھے۔ گھوڑے کی نوع کا خاصہ ہنہنانا ہے اس کے بدن پر بال ہوتے ہیں۔ قد سیدھا نہیں ہوتا۔ بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ زہر کا خاصّہ ہے کہ جو اُسے کھائے وہ مرجائے۔ سونٹھ کا خاصہ گرمی اور خشکی ہے اور کافور کا خاصہ ٹھنڈک ہے۔ اسی پر معدنیات، نباتات اور حیوانات کو قیاس کر لینا چاہئے۔

یہ بھی قانونِ طبعی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جس چیز میں جو خاصّہ رکھدیا ہے وہ اُس سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی طبعی امر ہے۔ کہ نوع تو بہت عام چیز ہوتی ہے لیکن اُسے خاص کرنے سے جنس کا اور جنس کو خاص کرنے سے فرد کا وجود سمجھ میں آتا ہے۔ اسی طرح فرد کے خواص نوع کے خواص میں خصوصیّت پیدا کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانی نوع کے لئے کوئی رنگ ہونا ضروری ہے یہ اس کا عام پہلو ہے یعنی کوئی رنگ ہؤا کرتا

ہے۔ لیکن فرد میں وہ رنگ معیّن ہوجاتا ہے مثلاً سیاہ رنگ یا گندمی رنگ،
غرض نوع میں خصوصیت پیدا کرنے سے جنس اور جنس میں خصوصیت پیدا
کرنے سے فرد کے خواص پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے "جسم" نہایت عام
چیز ہے۔ اس میں خصوصیت پیدا کرلیں تو بڑھنے والا جسم حاصل ہوگا۔
اس میں اور خصوصیت بڑھالیں تو حیوان حاصل ہوگا جو بڑھنے والے
جسموں میں سے زیادہ خاص ہے۔ پھر اس کے نیچے خاص خاص آدمی یعنی
افراد آتے ہیں۔ جیسے زید، بکر، عمرو وغیرہ۔ ظاہر میں یہ مرتبے ——
نوع، جنس، فرد —— ملے جلے ہیں۔ مثلاً زید فرد بھی ہے، جنس بھی۔
اور نوع بھی، حبشی جنس بھی ہے اور نوع بھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عقل
ان مرتبوں میں تمیز کرسکتی ہے اور ہر ایک خاصے کو اس چیز کی طرف
منسوب کرتی ہے جس کے لئے وہ ہے۔ مثلاً نوع کے خاصے نوع کو جنس
کے خاصے جنس کو، اور فرد کے خاصے فرد کو دیتی ہے۔ جب ہم ایک انسان
کو دیکھتے ہیں اُس میں طول عرض اور عمق پایا جاتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ یہ
جسم کا خاصہ ہے۔ چونکہ انسان میں جسمانیت موجود ہے اس لئے جسم کے
خاصے پائے جاتے ہیں۔ اس انسان میں خود حرکت کرنے کی قوت پائی
جاتی ہے اِس لئے وہ بڑھنے والا جسم بھی ہے۔ اس میں حواس اور زندگی
پائی جاتی ہے اس لئے وہ حیوان بھی ہے۔ پھر انسان سوچ بچار کرسکتا ہے
یہ انسان کا خاصہ ہے۔ یہ شخص ایک خاص زمانے میں پیدا ہوا (خاص ماحول

میں پیدا ہوا) اور خاص ماں باپ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے فرد ہے۔ یہ چیزیں اُس کی خصوصیت کی معلول ہیں یعنی کوئی خاصہ کہیں پایا جائے تو اس کی علت وہاں ضرور موجود ہو گی +

آنحضرت صلعم نے بہت سی چیزوں کے خاصے بیان کئے ہیں اور اُن آثار کو اُن چیزوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے فرمایا کہ تلبیہ جو ایک قسم کی خوراک ہے مریض کے دل کو راحت دیتا ہے۔ یا کلونجی موت کے سوا ہر ایک مرض کے لئے شفا ہے۔ یا اونٹوں کا پیشاب اور دودھ ان کے پیٹ کی بیماری کے لئے مفید ہے اور شُبرم (ایک قسم کا اناج) بہت گرم چیز ہے +

۳۔ تدبیر: جب مخلوقات کا ایک مجموعہ وحدت اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی مختلف چیزیں آپس میں مل کر ایک بن جاتی ہیں۔ تو اُس مرکب کی کئی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ لیکن وہ حکمت عامہ کے اعتبار سے ایک خاص مصلحت کا استعمال چاہتا ہے۔ اُس مجموعے کو اُس خاص مصلحت کے مطابق چلانا اور اُس میں اُس مصلحت کے مطابق ضروری تصرف کر کے ایسا نتیجہ نکالنا جو اس مصلحت عامہ کے قریب ہو، تدبیر کہلاتا ہے +

تدبیر کی چند مثالیں | مثال ۱: دیکھئے مصلحت عامہ کا تقاضا ہے کہ انسان اور حیوان ایک مدت تک اِس زمین پر زندہ رہیں۔ انسان اور حیوان کی زندگی نباتات پر موقوف ہے۔ اور زمین میں نباتات بغیر پانی کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ زمین کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں چشمے کا پانی طبعی طور پر نہیں پہنچ

سکتا۔ ایسے حالات میں اصل مقصد حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ سمندر سے پانی کے بخارات (بھاپ) اُٹھاتا ہے۔ اُنھیں اَبر کی شکل میں جمع کرتا ہے اور پھر اِن بادلوں سے مینہ برساتا ہے جس سے زمین کی جڑی بوٹیاں اُگتی ہیں۔ یہ تمام عمل تدؔبیر کہلاتا ہے جو اُس مصلحت کو پُورا کرتا ہے کہ جو انسان اور حیوان کی زندگی کے لئے ایک زمانے تک قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے +

مثال ۲: حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے دشمنوں نے آگ میں ڈال دیا لیکن حکمت الٰہی نے آگ میں ایسا تصرف کیا کہ وہ اُن کے لئے ٹھنڈی بن گئی۔ تاکہ وہ ایک زمانے تک زندہ رہیں۔ (یعنی ایک طرف تو ابراہیمؑ کا زندہ رہنا اجتماع انسانی کی عام مصلحت کا تقاضا ہے۔ دوسری طرف آگ کا خاصہ جلانا ہے۔ اب ضروری ہے کہ اس آگ میں تصرف کیا جائے۔ مثلاً اُس میں ایسی ٹھنڈی لطیف ہَوا داخل کر دی جائے کہ اُس کی ٹھنڈک آگ کی گرمی پر غالب آجائے۔ اِس تصرف کا نام تدؔبیر ہے۔) +

مثال ۳: سیدنا ایوبؑ کے بدن میں مرض کا مادہ جمع ہو چکا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے وہاں ایک ایسا چشمہ ظاہر کر دیا جس کی (معدنی) خاصیتوں سے اُن کو مرض سے شفا ہو گئی +

مثال ۴: زمین کے تمام انسانوں کی اجتماعی حالت اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسند تھی۔ اُن کے علاج کے لئے اللہ تعالےٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلّم کے دل میں الہام کیا کہ وہ لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرائیں۔ اور سیدھے راستے پر لانے کے لئے جہاد کریں تاکہ اس اجتماع میں سے ایک جماعت جسے اللہ پسند کرتا ہے تاریکیوں میں سے نکل کر نُور کی طرف آجائے +

قوتوں کا ٹکراؤ اور اُس کا نتیجہ | اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ عام مخلوقات میں جو قوتیں رکھی گئی ہیں وہ قوتیں اُس مخلوق سے الگ نہیں ہوسکتیں۔ جب ان قوتوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو حکمت الٰہی اِن کے ٹکراؤ اور تصادم سے کئی نئی چیزیں پیدا کردیتی ہے۔ ان نئی چیزوں میں سے بعض تو خود اپنی ذات سے قائم ہوتی ہیں (انھیں جوھر کہتے ہیں) بعض کا وجود کسی دوسری چیز کے وجود کے ساتھ ہوتا ہے (انھیں عرض کہتے ہیں) پھر عرض دو قسم کے ہوسکتے ہیں :-

(۱) جانداروں کے کام اور ان کے ارادے

(۲) کام اور ارادے کے سوا دوسرے اَعراض

خَیر اور شَر کیا ہے ؟ | ان قوتوں کے ٹکراؤ سے جو نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں اُن میں سے جو چیز اپنے سبب کے تقاضے پورا کرتی ہے یعنی جس سبب سے وہ وجود میں لائی گئی ہے وہ حکمت یا مصلحت اُس سے پوری ہوتی ہے تو کہا جائیگا کہ اِس میں بھلائی (خَیر) ہے اور جو سبب اُس کے پیدا ہونے کا کارن بنا ہے اس کے تقاضے کے مطابق کام نہ دے یا اُس کے خلاف کام کرنے کو کہا جائے گا کہ اِس میں بُرائی (شَر) ہے۔ جتنی چیزیں ـــــ جوھر

اور عرض ـــــ پیدا ہوئیں اُن میں شر نہیں ہے کیونکہ ہر ایک چیز اپنے پیدا کرنے والے سبب کا تقاضا پورا کرتی ہے یعنی وہ کام دیتی ہے جو اس سے چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ اچھی ہی ہے۔ جیسے تلوار اگر کاٹتی ہے تو اچھی ہے کیونکہ اس کے بنانے کا مقصد بھی کاٹنا ہی ہے۔ گو انسان کا قتل ہو جانا اپنی جگہ بُرا ہو +

شر دُور کرنے کے طریقے | اسی طرح جب کبھی مخلوقات میں عارضی طور پر ایسی بُرائی پیدا ہو جائے یعنی جو چیز مصلحت کے موافق پیدا ہونی چاہئے تھی وہ بعض قوتوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے پیدا نہ ہو اور دوسری چیز جو مصلحت کے خلاف ہے پیدا ہو جائے تو اللہ تعالےٰ کی مہربانی جو اُسے اپنی مخلوق پر ہے تقاضا کرتی ہے کہ اس عارضی قباحت یا خرابی کو دُور کر کے مصلحتِ عام کے مطابق حالت پیدا کر دے اور یہ اس کے لئے مشکل نہیں ہے کیونکہ وہ ہر ایک چیز پر براہ راست قدرت رکھتا ہے اور ہر ایک چیز اور اُس کے باطن (اندر) کو براہ راست جانتا ہے۔ وہ مفید حالت پیدا کرنے کے لئے ان چیزوں اور ان کی قوتوں میں قبض[1]، بسط[2]، احالہ[3] اور الہام[4] کے ذریعے تصرف کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اچھی حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے وہ پسند فرماتا ہے +

۱۔ قبض سے مُراد یہ ہے کہ کائنات کی جو قوتیں اللہ کی حکمت کی عام مصلحت کے خلاف کام کر رہی ہوں اُنھیں روک دینا۔ مثلاً کسی مُلک میں

قحط ڈالنا ہوتو، بارش کرنے والی ہواؤں کو اُس کی طرف چلنے سے روک دیتا ہے +

۲۔بسط: اِس سے مُراد یہ ہے۔ کہ جب حکمتِ الٰہی کوئی خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور دیکھتی ہے کہ وہ نتیجہ پیدا کرنے والی قوت کمزور ہے تو دوسری قوتوں کو اُس کی مدد کے لئے تیار کر دیتی ہے مثلاً جب اللہ تعالےٰ کسی محکوم قوم کو اُٹھانا چاہتا ہے تو حاکم قوم کو جنگ میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ مجبور ہو جاتی ہے کہ محکوموں کو مسلح کر کے جنگ میں بھیجے اور اُن کے بعض عقلمندوں کو سائنس کے وہ راز بتائے جن سے کام لے کر وہ سامانِ جنگ تیار کریں۔ اگر وہ جنگ نہ ہوتی تو حاکم قوم کبھی محکوم قوم کو نئی باتیں حاصل کرنے اور جنگ کے آلات کا استعمال سیکھنے میں مدد نہ دیتی) +

۳۔اِحالہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عنصر کو دوسری شکل میں بدل دینا تاکہ اصل مطلب حاصل ہو جائے (مثلاً جب اللہ تعالیٰ مینہ کے قطروں کو بادلوں میں جمع کرنا چاہتا ہے تو بادلوں میں آپس میں رگڑ پیدا ہوتی ہے اور یہ رگڑ بجلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے پھر بجلی سارے بادلوں میں دوڑ کر قطروں کو جمع کر دیتی ہے) +

۴۔الہام۔ خدا تعالیٰ جب کسی قوم کو اُٹھانا چاہتا ہے تو اُس قوم کے اُن لوگوں کو جنکے دل زیادہ صاف ہوں بعض تعلیمات الہام کرتا ہے۔ وہ ان تعلیمات پر عمل کرنیوالی ایک جماعت تیار کرتے ہیں اور انقلاب برپا کر کے نیا نظام قائم کر لیتے ہیں +

الہام کبھی تو سیدھا اس شخص کو ہوتا ہے جو مصیبت میں پھنسا ہوا ہو۔ کبھی اُس کے لئے کسی دُوسرے شخص کو ہوتا ہے +

قرآن حکیم نے تدبیر کی اتنی مثالیں دیدی ہیں کہ ان پر بڑھانیکی ضرورت نہیں ہے +

دوسرا باب (۲)

عالمِ مثال

دوسرا باب (۲)

عالمِ مثال

اس باب کا مضمون سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف عبقات کے مختلف موقعوں سے مختلف ٹکڑے جمع کر دیئے جائیں +

عالمِ مثال کیا ہے ؟ | ایک انسان کی دماغی قوتوں پر نظر دوڑایئے۔ حواس (Senses) کا مجموعہ کہیں اُس کے دماغ میں مرکز پیدا کر لیتا ہے، اُسے حسِ مشترک (Common Sense) کہتے ہیں۔ اُس کے

بعد ایک قوت ہے جس کا نام خیال (Imagination) ہے اُس کے ذریعے انسان اُن صورتوں کو سمجھتا ہے جن میں مادے کی صفات یعنی شکل (Form) رنگ (Colour) اور مقدار (Magnitude) موجود ہو۔ مگر مادہ (Matter) نہ ہو۔ تیسری قوت کا نام وہم (Fancy) ہے۔ اس سے انسان خاص خاص چیزوں کا ادراک (Cognition) کرسکتا ہے اس کے بعد ایک چوتھی قوت ہے جس کا نام عاقلہ (Reason) ہے۔ یہ اُن چیزوں کا ادراک (Cognition) کرتی ہے۔ جو مادے سے پاک ہوں +

سلسلۂ کائنات میں ایک ایسا عالم مان لیا جائے۔ جو "شخص اکبر" (Universum Permagnum) سے وہی نسبت رکھتا ہے جو عقلی صُورت ہمارے دماغ سے وہ صُورت مادّے سے پاک ہوتی ہے۔ اسے عالم اَرواح (Spiritual World) کہتے ہیں +

اِسی طرح اس سلسلۂ کائنات میں ایک اور عالم فرض کیجئے جس کی "شخص اکبر" کے ساتھ وہی نسبت ہے جو خیالی صورتوں کی ہمارے دماغ کے ساتھ ہے، اس میں شکل اور مقدار بھی پائی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِس طرف ہے یا اُس طرف لیکن مادّہ نہیں ہوتا۔

اسے عَالِمِ مِثال (SuPer-Material World) کہتے ہیں۔ جو چیز ہمارے خیال میں موجود ہے۔ اُسے ہم دو طرح سوچ سکتے ہیں :-

(۱) ہم جانتے ہیں کہ وہ مثالی چیز ہے اور اُسے خارجی دُنیا کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں ہے اس وقت ان چیزوں کو اصل ناموں سے یاد کرنا مجازاً ہوگا حقیقۃً نہ ہوگا۔ مثلاً ہم سُورج کا تصوّر خیال میں کرتے ہیں اور پھر اُس خیالی صورت کو "سُورج" کہتے ہیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کاغذ پر شیر کی تصویر کھینچی ہو اور ہم اسے "شیر" کہیں +

(۲) ہم خیالی چیزوں کا تصوّر کریں مگر ہمیں یہ تمیز نہ ہو کہ یہ خیالی ہیں۔ جیسے خواب میں سمندر کو دیکھ کر ہم سمندر ہی کہتے ہیں۔ اس وقت ہم یہ لفظ اس کے حقیقی اور اصلی معنوں میں استعمال کرتے ہیں +

اسی طرح عالمِ مثال اگرچہ "شخص اکبر" کے اعتبار سے خیال کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جس شخص کی سارے "شخص اکبر" پر نظر نہ ہو، وہ اُسے حقیقی عالم سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ اُسے مادی عالم سے بھی زیادہ پائدار پاتا ہے۔ اُس کے نزدیک جس قدر چیزیں مادی دُنیا میں موجود ہیں وہ اصل میں تو عالمِ مثال میں موجود ہیں مادی دُنیا میں اُن کے عکس یا سائے آئے ہوئے ہیں +

عالم مثال کے طبقے | مسلمان حکیم عالم مثال کو مادی دنیا سے بہت زیادہ لطیف مانتے ہیں۔ اسی لیئے وہ کہتے ہیں کہ وہ اس جہان سے "اوپر" ہے۔ اسی طرح عالم مثال کے مختلف طبقے ہیں جن میں سے ایک دوسرے سے زیادہ لطیف اور قوی ہے +

عالم مثال کا ایک نچلا طبقہ ایسا ہے جس میں انسانوں کے عقیدوں کی تاثیر سے خاص خاص صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی سا کام ہو جس پر انسانوں کی ایک بڑی جماعت جمع ہو جائے اور اُسے پختہ عقیدہ بنا لے، خواہ وہ بات سچی ہو یا جھوٹی، اُس اجتماع سے عالم مثال کے نچلے طبقے میں ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے ساتھ اس عقیدے کے ماننے والے تعلق پیدا کر کے کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن عالم مثال کا ایک اوپر کا طبقہ ہے، جس میں حق کے سوا اور کوئی چیز جگہ نہیں پکڑ سکتی انبیاء اور حکماء الٰہی کا تعلق اس مرکز کے ساتھ ہوتا ہے +

سماء اور افلاک | عالم مثال کے اوپر کے طبقوں کو "سماء" کہتے ہیں اور نچلے طبقوں کو "جوّ" (فضا) اور اس عالم شہادی یا عالم مادی کو "زمین" کہتے ہیں۔ "سماء" اصل میں عالم مثال کے ایک طبقے کا نام ہے۔ لیکن بعد میں ارسطو وغیرہ کے فلسفے کے اثر سے "افلاک" کہا جانے لگا +

عالم مثال میں نزول اور صعود | ایک چیز عالم مثال کے اوپر کے طبقے میں

موجود ہے۔ جب اس کا عکس نچلے طبقے میں آتا ہے اُسے نزول کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ چیز تو اُس اُونچے طبقے ہی میں رہتی ہے مگر اس کی مثل یا عکس نچلے طبقے میں آجاتی ہے۔ اسی طرح نچلے طبقے میں کوئی چیز موجود ہو اور اس کی مثل اوپر کے طبقے میں بن جائے تو اسے صُعود (چڑھنا) کہتے ہیں +

عالمِ مثال کے ماننے کی ضرورت مولانا اسماعیل شہیدؒ کہتے ہیں کہ جو شخص عالمِ مثال کو نہ مانے وہ اہلِ سنّت میں محقق شمار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُسے قرآن اور حدیث کی ہزار سے زیادہ باتوں کی ایسی تاویل کرنی پڑے گی جو بہت دُور جا پڑے گی۔ پس جو شخص قرآن شریف اور حدیث کے تفصیلی طور پر پڑھنے پڑھانے کی طرف متوجّہ ہو۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا اعتقادیہ بنائے کہ جو چیزیں عالمِ محسوس (مادی دُنیا) میں پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کا اس دُنیا میں آنے سے پہلے اللہ تعالےٰ کے ہاں ایک قسم کا وجود ہوتا ہے۔ اور جب یہ چیزیں اس مادی دُنیا سے غائب ہو جائیں گی تو اُس کے بعد بھی اللہ تعالےٰ کے ہاں اُن کا کسی قسم کا وجود رہے گا۔ اور بعض لمبی چوڑی چیزیں ہیں جو اس عالم کے چھوٹے ٹکڑے میں سما جاتی ہیں اور اس سے اُن کی آپس میں ٹکّر نہیں ہوتی۔ غرض ان باتوں کے سمجھنے کے لئے ایک محقق کو ایک واسطے (Medium) کا

ماننا ضروری ہے۔ علم طبیعیات میں اس کی مثال ایتھر (Ether) کی ہے، کہ روشنی، برق اور مقناطیس وغیرہ کی لہروں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے لیے اسے ایک واسطے کے طور پر ماننا ضروری ہے۔ صدیوں کی کوشش کے بعد جب کسی اور طرح یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ یہ شعاعیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح پہنچتی ہیں تو کسی عقل مند نے تجویز کیا کہ ان کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کا ضرور کوئی ذریعہ یا واسطہ ہے۔ اس واسطے کا نام "ایتھر" (Ether) رکھا گیا۔ اب اس کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ یہ ہر موٹی اور ٹھوس چیز کے آرپار گزر جاتا ہے۔ تبھی تو بعض قسم کی لہریں ٹھوس چیزوں کے آرپار گزر جاتی ہیں ایسے ہی طبیعاتی دنیا سے اوپر کی دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں انھیں حل کرنے کیلئے ایک واسطے کے ماننے کی ضرورت ہے جس کا نام عالم مثال رکھا گیا ہے +

عالم مثال کا ذکر حدیث اور قرآن میں

واضح رہے کہ بہت سی حدیثوں سے یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ اس کائنات میں ایک ایسا عالم بھی موجود ہے جو اس مادی عالم کی طرح نہیں ہے بلکہ عنصریت یا مادیت سے پاک ہے۔ جن چیزوں کی اِس مادی دُنیا میں کوئی شکل اور صورت نہیں ہے، جیسے علم، موت وغیرہ، اُن چیزوں کے لئے بھی اُس عالم میں مناسب صورتیں موجود ہیں۔ اور جب کوئی چیز اس دُنیا میں وجود میں آتی ہے تو ایک طرح

سے وہ پہلے اُس عالم میں وجود میں آچکتی ہے۔ اُس عالم کو عالمِ مثال کہتے ہیں۔ جو چیز مادی دُنیا میں وجود میں آتی ہے۔ اُس کی نسبت یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جو عالمِ مثال میں فلاں چیز تھی۔ ایسے ہی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں عام لوگ جسمانی نہیں مانتے وہ اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے اِس دُنیا میں آتی ہیں اور سب لوگ انھیں نہیں دیکھ سکتے ہیں البتہ خاص خاص لوگ اُنھیں دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے حدیثوں میں ذکر آتا ہے۔ کہ :-

(۱) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے "رشتہ داری" کو پیدا کیا تو اُس نے فریاد کی کہ "مجھے رشتہ داری کے کاٹنے والوں سے پناہ دیجئے" +

(۲) سُورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران، قیامت کے روز دو بادلوں کی شکل میں آئیں گی یا ایسے جیسے پرندوں نے پَرا باندھا ہو۔ جو لوگ اِن سُورتوں کی تلاوت کیا کرتے ہوں گے اُن کی طرف سے وہ مدافعت کریں گی یعنی اُن کو اللہ تعالےٰ کے غضب سے چھڑانے کی کوشش کریں گی +

(۳) قیامت کے روز انسان کے اعمال آئیں گے۔ پہلے نماز، پھر صدقہ، پھر روزہ +

(۴) "معروف" (نیکی) "منکر" (بدی) دو مخلوق ہوں گے جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے کھڑے کر دئے جائیں گے۔ "معروف" اپنے دوستوں

کو جو نیکی کر چکے ہوں گے ، خوشخبری دے گا اور "منکر" اپنے دوستوں کو جو بدی کر چکے ہوں گے "دور ! دور !" کہے گا اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے کہ منکر کو چمٹ جائیں +

(۵) قیامت کے دن "دنیا" ایک بڑھیا کی شکل میں لائی جائیگی جس کی آنکھیں نیلی اور داڑھیں بڑی بڑی اور صورت شکل نہایت مکروہ ہوگی +

(۶) اللہ تعالٰے قیامت کے روز تمام "دنوں" کو اپنی اصلی حالت پر پیدا کرے گا ۔ چنانچہ جمعے کا دن روشن ہوگا +

(۷) کیا تم دیکھتے ہو جو کچھ میں دیکھتا ہوں ؟ میں تمہارے گھروں میں آپس میں لڑنے کے موقعے اس کثرت سے پیدا ہوتے دیکھ رہا ہوں جیسے بارش کی بوندیں پڑتی ہیں +

(۸) معراج کی حدیث[1] میں ہے کہ آپؐ کو چار نہریں دکھائی دیں دو زمین کے اندر بہتی تھیں اور دو سطح کے اوپر ۔ میں نے کہا جبریل ! یہ کیا ہیں ؟ اس نے کہا کہ جو ندیاں اندر بہ رہی ہیں وہ تو جنت میں جا رہی ہیں اور جو اوپر بہ رہی ہیں ان میں سے ایک نیل ہے اور دوسرا فرات +

---

[1] یعنی وہ حدیث جس میں آنحضرت صلعم کے معراج کا ذکر ہے ۔ معراج سے مراد آنحضرت صلعم کی روحانی دنیا کی سیر ہے + (مرتب)

(۹) کسوف کی حدیث میں ہے کہ مجھے میرے اور قبلے کی دیوار کے بیچ میں جنّت اور دوزخ کی صورت دکھائی گئی۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے اور قبلے کی دیوار کے درمیان اتنا تھوڑا فاصلہ تھا کہ جنّت اور دوزخ اپنے اصلی لمبائی چوڑائی کے ساتھ اُس جگہ نہیں سما سکتیں ٭

(۱۰) اُسی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ہاتھ بڑھایا کہ جنّت کے انگور کا ایک خوشہ لے لیں اور اُسی میں ہے کہ آپؐ آگ کی لپٹ کے سبب پیچھے ہٹ گئے اور اُس کی گرمی کے سبب سے آپ کا سانس تیز ہو گیا ٭

(۱۱) آپؐ نے دوزخ میں اُس آدمی کو دیکھا جو حاجیوں کی چیزیں چُرایا کرتا تھا اور اُس عورت کو بھی دیکھا جس نے بلّی کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ بھُوکوں مر گئی ٭

(۱۲) آپؐ نے جنّت میں اُس زنا کرانے والی عورت کو دیکھا جس نے پیاسے کُتّے کو پانی پلایا تھا ٭

(۱۳) جنّت کے گرد مکروہ چیزوں کی باڑ لگائی گئی ہے اور جہنّم کے گرد خواہشات پیدا کرنے والی چیزوں کی باڑ لگائی گئی ہے ٭

(۱۴) فرمایا کہ کوئی مصیبت اُترتی ہے تو دُعا اُس سے کُشتی کر کے اُسے گرا دیتی ہے (یعنی دُعا مصیبت کو دفع کر دیتی ہے) ٭

(۱۵) فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا کہ سیدھا مُنہ کر کے کھڑی ہو جا۔ چنانچہ وہ سیدھا مُنہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ پھر اُسے فرمایا کہ پیٹھ پھیر کر

کھڑی ہو جا چنانچہ وہ اُسی طرح کھڑی ہو گئی +

(۱۶) فرمایا کہ یہ دو کتابیں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ (چنانچہ آپؐ نے دونوں کتابیں لوگوں کو دکھائیں پھر وہ غائب ہو گئیں) +

(۱۷) فرمایا کہ موت مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی اور جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دی جائے گی +

(۱۸) قرآن حکیم میں بھی اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ہم نے مریم کی طرف رُوح کو بھیجا تو وہ اُس کے سامنے ایک پورے انسان کی صورت میں گیا +

(۱۹) آنحضرت صلعم کی حدیثوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جبرئیلؑ آپؐ کے پاس آتے تھے۔ آپؐ اُسے دیکھتے تھے اور اُس سے باتیں کرتے تھے لیکن دوسرا کوئی شخص اُسے نہ دیکھتا تھا +

(۲۰) حدیث میں آتا ہے کہ قبر ستر ہاتھ طول اور ستر ہاتھ عرض کے برابر وسیع کر دی جائے گی یا اتنی تنگ کر دی جائے گی کہ میت کی پسلیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی +

(۲۱) فرشتے قبر میں میت کے پاس آتے ہیں اور اُس سے پوچھتے ہیں +

(۲۲) قبر میں میت کا "عمل" ایک خاص شکل میں ظاہر ہوتا ہے +

(۲۳) موت کے قریب فرشتے انسان کے پاس آتے ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں ریشم یا ٹاٹ ہوتا ہے +

(۲۴) فرشتے میّت کو قبر میں لوہے کے ہتھوڑوں سے مارتے ہیں۔ اور وہ اتنے زور سے چیختا ہے۔ کہ مشرق اور مغرب میں اس کی آواز سُنائی دیتی ہے +

(۲۵) کافر پر اُس کی قبر میں ۹۹ اژدھے مقرر کردئے جاتے ہیں جو اُسے کاٹتے اور ڈستے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے +

(۲۶) فرمایا کہ جب میّت کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا سُورج ڈوبنے کو ہے۔ وہ آنکھیں مل کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنے دو +

(۲۷) حدیثوں میں کثرت سے آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ قیامت کے روز لوگوں کے لئے مختلف صورتوں میں تجلّی فرمائے گا +

(۲۸) یہ بھی وارد ہو چکا ہے کہ اللہ تعالےٰ انسان کے ساتھ بغیر کسی ترجمان کے باتیں کرے گا +

اسی طرح اَور بہت سی روایتیں ہیں جنکی کثرت کی وجہ سے یہاں لانا ممکن نہیں +

جو شخص ان حدیثوں پر نظر ڈالتا اور غور و فکر کرتا ہے اُسے تین باتوں میں سے ایک نہ ایک کو ماننا پڑتا ہے :-

ظاہری معنی | (۱) وہ اِن کے ظاہری معنے مان لے تو پھر اُس قسم کے عالَم (عالمِ مثال) کو ماننے پر، جس کا ہم نے ذکر کیا ہے مجبور ہو جاتا ہے، اور یہ وہ بات

ہے جو حدیث کے عالموں کے قاعدے کے مطابق ہے۔ یعنی جب تک کسی حدیث کے ظاہری معنی کو عقل کے لحاظ سے ناممکن نہ سمجھیں اور اُس کا کوئی حل تلاش کر سکیں اُسے ظاہری معنوں ہی میں لیتے ہیں۔ سیوطیؒ نے ایسا ہی لکھا ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں +

فریب نظر | (۲) کوئی شخص یوں سمجھے کہ دیکھنے والے کو یہ چیزیں اس طرح نظر آئیں گی۔ اور اُس کی نگاہ کے سامنے ایسی شکل پیش ہو جائے گی۔ اگرچہ اس کی حس (دیکھنے کی طاقت) کے باہر اُن کا کوئی وجود نہیں ہوگا +

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ[۱] نے قرآن حکیم کی اس آیت کا حل کہ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (جب آسمان دھوئیں کی شکل میں نظر آئے گا[۲]) اسی کے فریب قریب بنایا ہے اور فرمایا ہے کہ اس زمانے میں مکہ والوں میں اس قدر قحط پڑا۔ کہ جب کوئی شخص کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو اُسے بھوک کے سبب سے دھواں سا دکھائی دیتا تھا +

ابن ماجشون[۳] سے نقل کرتے ہیں کہ حدیثوں میں جو اکثر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا نظر آئے گا اور محشر میں کبھی کسی طرح نظر آئے گا کبھی کسی طرح، اُس سب کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی مخلوق

---

[۱] حضرت عبداللہ بن مسعود: ایک مشہور صحابی

[۲] سورہ دخان: ۱۰

[۳] ابن ماجشون: مالکی اماموں میں سے ایک بڑا امام +

کی آنکھوں میں تصرّف کر دے گا۔ جس سے انھیں ایسا دکھائی دے گا کہ گویا اللہ تعالےٰ نیچے اُتر آیا ہے۔ اس نے تجلّی فرمائی ہے اور وہ اپنی مخلوق کے ساتھ رازداری کی باتیں کر رہا ہے۔ اور انھیں بلاواسطہ مخاطب فرما رہا ہے حالانکہ اللہ تعالےٰ اپنی عظمت اور بزرگی پر اپنے اصل حال میں قائم ہوگا اس میں کوئی فرق نہ آیا ہوگا۔ نہ اُس نے جگہ بدلی ہوگی نہ شکل۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ تعالےٰ ہر ایک چیز پر پُوری پُوری قدرت اور اختیار رکھتا ہے +

استعارہ | (۳) اِس قسم کی حدیثوں کو کوئی اَور معنی سمجھنے کے لئے مثال قرار دیا جاتے +

جو شخص اِن حدیثوں کو تیسرے درجے میں لیتا ہے یعنی ضرورت کے وقت اَور معنی لینے کا قائل ہے ہم اُسے اہلِ حق میں شمار نہیں کرتے +

امام غزالیؒ کی تصریح | امام غزالیؒ قبر کے عذاب کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے یہ تینوں باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کا بیان یہ ہے:

"اس قسم کی حدیثوں کے ایک ظاہری معنی جو صحیح ہیں۔ ان میں بھید کی باتیں ہیں جو اُن لوگوں کو نظر آتی ہیں جن کے دل روشن ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص ان حدیثوں کا اصل مطلب نہ سمجھ سکے، وہ ان کا انکار نہ کرے۔ بلکہ اُسے ایمان کا کم سے کم درجہ یعنی ایسی باتوں کو سچ مان لینا پیدا کرنے کی کی کوشش کرنی چاہیئے، اگر کہا جائے کہ ہم کافر کو اس کی قبر میں ایک عرصے

تک دیکھتے رہتے ہیں۔ اور جو کچھ حدیثوں میں آیا ہے اُس میں سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا تو مشاہدے کے خلاف کوئی بات کیسے مان لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کو ماننے کے تین درجے ہیں:۔

(۱) جو سب سے ظاہر، صحیح اور جھگڑوں سے خالی ہے وہ تو یہ ہے کہ یہ مان لیا جائے۔ کہ واقعی سانپ موجود ہیں اور وہ میّت کو ڈس رہے ہیں لیکن ہم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے کہ ہماری آنکھیں غیر مادی دُنیا (عالمِ ملکُوت) کی چیزیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور آخرت کے متعلق جو ذکر آیا ہے اُس کا تعلق غیر مادی دُنیا (عالمِ ملکُوت) ہی سے ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ صحابہ جبرئیل کے آنے پر ایمان رکھتے تھے مگر وہ اُسے دیکھتے نہیں تھے؟ اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے دیکھ رہے ہیں۔ جو شخص جبرئیل کے آنے کا یقین نہیں رکھتا۔ اُس کے لئے قبر کے مسئلے کی نسبت یہ زیادہ ضروری ہے کہ وہ وحی اور فرشتوں کے متعلق اپنا ایمان درست کرے۔ اگر تم اسے جائز سمجھتے ہو کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ایک چیز کو دیکھ لیں جسے دُوسرے لوگ نہ دیکھ رہے ہوں تو میّت کے حق میں یہ کیوں جائز قرار نہیں دیتے کہ اُسے سانپ اور بچھو ڈس رہے ہوں جو ہمیں اس لئے نظر نہ آتے ہوں کہ وہ دوسری دُنیا کی چیزیں ہیں؟ جیسے فرشتے اِس دُنیا کے انسانوں اور حیوانوں کی طرح نہیں ہیں اس لئے نظر نہیں آتے۔ ویسے ہی سانپ اور بچھو

جو قبر میں ڈستے ہیں ہماری دُنیا کے سے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک نئی جنس کے ہیں اور وہ ایک دوسرے حواسّ ہی سے دکھائی دے سکتے ہیں جو عام طور پر ہم میں نہیں پایا جاتا +

(۲) سوئے ہوئے آدمی کا تصوّر کرو۔ وہ کبھی خواب میں دیکھتا ہے کہ اُسے سانپ ڈس رہا ہے۔ اِس سے اِسے تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ چیخ اُٹھتا ہے اور اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے۔ بلکہ وہ بڑے زور سے اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنے اندر دیکھ رہا ہے اور اُس سے ویسے ہی تکلیف اُٹھاتا ہے جیسے جاگنے کی حالت میں اُٹھاتا ہے۔ حالانکہ ہم اِس کے اِرد گرد کوئی سانپ، وغیرہ نہیں پاتے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ سانپ یقیناً موجود ہے، اور جب عذاب حقیقت میں اِس تکلیف سے مُراد ہے جو سانپ کے ڈسنے سے پیدا ہوتی ہے تو خواہ سانپ خارج میں موجود ہو یا انسان کے تخیل میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا +

(۳) یہ ظاہر ہے کہ اصل میں سانپ کی ذات سے کوئی درد وغیرہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ تکلیف دینے والی وہ چیز ہے جسے ہم سانپ کا زہر کہتے ہیں۔ پھر زہر بھی اپنی جگہ درد نہیں ہے بلکہ درد سے مُراد تکلیف کا وہ احساس ہے جو زہر سے پیدا ہوتا ہے۔ اب فرض کرو کہ درد کا ایسا ہی احساس بغیر زہر کے پیدا ہو جائے تو تکلیف پورے معنوں

میں محسوس ہوگی اور اُسے سانپ کے ڈسنے ہی کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ کیونکہ اس تکلیف کی اُس وقت تک پوری طرح سمجھ نہیں آ سکتی جب تک اُسے اُس سبب کی طرف منسوب نہ کیا جائے جو اُسے عام طور پر پیدا کرتا ہے۔ (مثلاً مٹھاس کا ذائقہ کسی میٹھی چیز کی طرف منسوب کئے بغیر سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا اور گلاب کی سی خوشبو سونگھتے ہی گلاب کا تصور آ جانا طبعی چیز ہے) اسی طرح انسان کے اندر جو مہلک صفتیں اور عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں وہی موت کے وقت ایذا اور تکلیف دینے والی بن جاتی ہیں۔ اور ان کا درد سانپ وغیرہ کے ڈسنے کے مشابہ ہوتا ہے۔ گو اصل میں سانپ وہاں موجود نہیں ہوتا"+

تیسرا باب (۳)

ملاءِ اعلیٰ

تیسرا باب (۳)

ملاءِ اعلیٰ

تین قسم کی مخلوق | جن ہستیوں میں علم اور حرکت پائی جاتی ہے۔ وہ تین قسم کی مانی جاتی ہیں :—

(۱) کثیف مادّے سے تعلق رکھنے والی ہستیاں، جیسے انسان اور حیوان +

(۲) اِس کثیف مادّے سے زیادہ لطیف مادّے سے تعلق

رکھنے والی چیزیں اس قسم کے مادّے کو آگ (نار) کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ نار سے پیدا ہونے والی چیزوں میں سے جنات ہیں۔

(۳) نہایت لطیف مادّے پیدا ہونے والی مخلوق۔ انھیں فرشتے کہتے ہیں اور لطیف مادّے کو نور کہا جاتا ہے۔

تجلّی اور عرش اس تمام کائنات کی مرکزی قوت جہاں سے تمام حادثات (Events) ظاہر ہوتے ہیں اور جہاں ہر چیز لوٹ کر جاتی ہے وہ تجلّی اعظم کا دوسرا درجہ ہے جو شخص اکبر کے قلب یعنی عرش پر قائم ہے۔ عرش کو ساری مخلوقات کے لئے ایک محیط تصوّر کر لیجے "تجلّی اعظم" کا تعلق اس کے سب حصّوں کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ فَاسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (تجلّی عرش پر برابر ہو گئی یعنی عرش کا کوئی حصہ اور کوئی جز تجلّی کے اثر سے باہر نہ رہا)۔

اگرچہ عرش کے بعض حصّوں کو دوسرے حصّوں پر برتری حاصل ہے یعنی تجلّی کا اثر اُن پر زیادہ ہے لیکن ہم یہ حصّے معین نہیں کر سکتے۔ اس ممتاز جگہ سے زمین کی طرف بے انتہا نور کی لہریں آ رہی ہیں۔ اگر کوئی ہستی عرش کے اس خاص حصّے کے پاس پہنچ جائے، تو وہ "تجلّی اعظم" کو واضح طور پر دیکھ سکتی ہے۔ اس موقع کو خاص کرنے میں ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسانی جماعت (نوع) کو

اللہ تعالیٰ سے جو تعلّق ہے فقط اُسی نقطے پر بحث کی جائے۔ یعنی اُس نقطے پر جہاں سے نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کا فیض برس رہا ہے۔ باقی تمام عالَم کے تعلقات کو اُتنا ہی سمجھیں گے جتنا ہمارے مسئلے سے تعلّق ہوگا +

انسانِ اکبر | اب فرض کیجیے کہ عرش کے نیچے بھی اس نورانی جگہ کے قریب تمام انسانوں کی انسانیت کا ایک مجسّمہ موجود ہے۔ اسے صوفیوں کی اصطلاح میں "انسانِ اکبر" یا "امامِ نوعِ انسانی" کہتے ہیں۔ اس انسانِ اکبر کے دل و دماغ پر تجلّیِ اعظم کی ایک تجلّی پڑتی ہے۔ انسانی نوع کا اس انسانِ اکبر کے ساتھ ایسا تعلّق ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح سے حیوانوں کی ہر ایک نوع کا ایک ایک "امام" وہاں موجود ہے اور ہر ایک نوع کے ہر ایک فرد کا اپنے اپنے "امام" کے ساتھ تعلّق ہے اور یہ تعلّق ایک قسم کی مَلَکی قوت کے ذریعے سے قائم ہے۔ جیسے زمین کے ہر ایک ذرّے کا ایک قسم کی کشش کے ذریعے سے تعلّق ہے +

انسانی نوع کے اندرونی اجزاء یعنی افراد میں تعلّق پیدا کرنے والی بھی یہی قوت ہے۔ پھر انسانِ اکبر کے وجود کے اندر ہر قسم کی قوتوں کے الگ الگ مرکز ہیں۔ ہر ایک مرکز کا دوسرے مرکز کے ساتھ تعلّق قائم رکھنا بھی اِسی قوت کا کام ہے انسانِ اصغر

یعنی عالم انسانی فرد (Microcosm) کے اندر جو قوت کام کر رہی ہے وہ یہی ملکی قوت ہے جس کے ذریعے سے اُس کا اپنے امام ـــــ انسانِ اکبر ـــــ کے ساتھ تعلق ہے +

اب ایک انسانی فرد کو لیجئے۔ اس کے اندر حواس (Senses) ہیں۔ عقلی قوت (Reason) ہے۔ تخیّل (Imagination) ہے وغیرہ وغیرہ یہ تمام اُن فرشتوں یا نورانی قوتوں کے نمونے ہیں، جو "انسانِ اکبر" کے اندر کام کر رہی ہیں +

حظیرۃ القدس اور ملاءِ اعلیٰ	اس مرکز میں جہاں "انسانِ اکبر" اور باقی حیوانوں کے امام نوع درجہ بدرجہ اس کے آگے موجود ہیں

وہاں فرشتوں کی مرکزی جماعت کی سب سے بڑی قوت بھی موجود ہے۔ تجلّیٔ اعظم سے انسانی نوع کے اتّصال (ملنے) کا قبلہ یہی مقام ہے۔ انسان کی ساری توجّہ اسی نقطے پر لگی ہوئی ہے۔ اور اسی نقطے کے ذریعے سے تجلّیٔ اعظم کو پہچانا جاتا ہے۔ اس موقعے یا مقام کا نام حظیرۃُ القُدُس (Sanctorum Permagnum) ہے۔ یہاں فرشتے موجود ہیں اور بڑے بڑے انسانوں کی رُوحیں وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ یہ تمام جماعت جس میں فرشتے اور بڑے انسانوں کی روحیں شامل ہیں مَلَاءِ اَعْلیٰ (Populus Sanctus) کہلاتی ہے ان سب کا قبلہ تجلّیٔ اعظم ہے جو انسانِ اکبر کے قلب پر پڑ رہی ہے +

ملاءِ اعلیٰ کی تین قسمیں | ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی تین قسمیں ہیں :-

(۱) حاملینِ عرش: یعنی وہ جنھوں نے عرش کو سہارا ہوا ہے +

(۲) حافّینِ حول العرش: یعنی عرش کے گرد چکر کاٹنے والے +

(۳) علّیّین: جیسے سورج کا اثر زمین پر پہنچتا ہے اور دھوپ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور ایک خاص قسم کی زندگی پیدا کرتا ہے ، عالمِ مثال کے جس ٹکڑے میں علّیّین کا نور اس طرح برس رہا ہو اُس کا نام جنّت ہے +

انسان کی ترقّی | جنّت کی حد سے آگے یعنی جہاں سے آگے علّیّین کا نور نہیں جاتا ، وہاں تک انسان اپنی کوشش سے پہنچنا چاہے تو اُسے بڑی محنت چاہیئے۔ لیکن تجلّیٔ اعظم کی کشش خود بخود انسان کو اس کی قابلیت کے مطابق اپنی طرف کھینچے گی +

انسان کی محنت اُسے جہاں تک پہنچا سکتی ہے وہ یہ حد ہے کہ انسان حظیرۃ القدس کا رُکن (ممبر) بن جائے +

جہنّم کیلیے ہے؟ | انسان کے دل و دماغ میں جو علم اور جذبات موجود ہیں وہ دینی فطرت پر صحیح ہوں تو ان کی طبعی خواہش یہ ہے کہ حظیرۃ القدس کے حصّہ علّیّین یعنی جنّت میں پہنچ کر آرام کرے۔ اگر کوئی انسان نشّے کی بدمستی میں اپنی انسانی ضرورتوں کو جمع نہ کرے اور جنّت میں جانے کی قابلیت کھو بیٹھے ، تو جس وقت اُس کا خمار موت کے بعد اُترے گا وہ

اپنے اندر سے درد اور تکلیف محسوس کرے گا۔ اُدھر سے حظیرۃ القدس کی طرف پہنچنے کا شوق بیدار ہوگا۔ اس لئے وہ اپنے آپ سے نفرت کرے گا کہ میں کیوں پیچھے رہ گیا۔ اب جس آدمی کا یہ درد زیادہ بڑھا ہوا ہوگا اُسے ایسا معلوم ہوگا گویا ہر چیز کھانے کو آرہی ہے۔ یہی جہنم ہے اس میں انسان اپنی غلطیوں کی سزا بھگتے گا اور پھر رفتہ رفتہ صاف ہوکر ایک زمانے کے بعد حظیرۃ القدس کی طرف رُخ کرے گا +

دوزخ سے ترقی کس طرح ہوگی ؟ اس کا علم ہمیں کم دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اِس دُنیا میں اس کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہے، اور جنت سے اوپر حظیرۃ القدس کی جو ترقی ہے وہ بھی صاف طور پر بتائی نہیں گئی +

حظیرۃ القدس کے باہر دوسرے درجے کے فرشتے ہیں۔ اِن فرشتوں کے پھر کئی قسم کے طبقات ہیں ۔ ہماری زمین کے قریب فرشتوں کا جو طبقہ ہے وہ یُوں سمجھنا چاہیئے کہ ساتواں طبقہ ہے اور یہاں پہنچ کر فرشتوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے +

اس سے نیچے تیسرے درجے کے فرشتے اور جنات کام کرتے ہیں +

دوزخ میں جو قوتیں کام کر رہی ہیں وہ اُوپر ہی طرح کی ہیں، انسان جنتوں اور فرشتوں کے برابر ترقی کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ انس

درجے کے فرشتوں تک پہنچ جاتا ہے +

جنت کی تمام چیزیں دُنیاوی ناموں سے بتائی گئی ہیں جیسے پانی، دودھ، شہد، میوہ وغیرہ۔ مگر یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان چیزوں کو ہمارے ذہن کے قریب لانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ورنہ اصل میں وہ عالمِ مثال کے اوپر کے طبقوں کی نوعیت کی ہیں۔ اُس عالم کی نعمتیں اِس عالم کی چیزوں سے فقط ناموں میں مشابہ ہیں ورنہ اصل میں بہت ہی بُلند درجے کی چیزیں ہیں +

ملاءِ اعلیٰ کا ذکر قرآن میں | اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ وَالَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۔ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔

(یعنی وہ فرشتے جو عرش کو تھامے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے گرد اگرد ہیں (یعنی حافین حول العرش اور علیین) وہ سب اللہ کو حمد اور تسبیح سے یاد کرتے ہیں۔ اور اللہ کا حکم ماننے کے لئے ہر دم اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں اور ایمان والے لوگوں کے لئے بخشش کی دعائیں مانگتے ہوئے کہتے ہیں

کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر ایک چیز پر حاوی ہے الٰہی! اُن لوگوں کو جو تیری طرف متوجہ ہوئے اور تیرے راستے پر چلنے لگے اُن کی غلطیاں بخش دے اور اُنھیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے پروردگار! اُنھیں اُن باغوں میں داخل کر جن میں وہ ہمیشہ رہیں جن کا تُو نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے اور اُن کے ساتھ اُن کے شائستہ باپ دادا کو بیویوں کو اور بچّوں کو بھی اِنہی ہمیشگی کے باغوں میں داخل کر تو بہت عزّت دینے والا اور دانائی بخشنے والا ہے۔ کم سے کم یہ کہ انھیں تکلیف سے بچا۔ واقعی اُس روز جو تکلیف سے بچ گیا اُس پر تیری بڑی ہی رحمت ہے۔ اور یہ پوری کامیابی ہے[1] ۔

حدیثوں میں ملاءِ اعلیٰ کا ذکر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ "اِذا قضی اللہُ تعالیٰ الامر فی السماءِ ضربت الملائکۃُ باجنحتِہا خضعانًا لقولہٖ کانّہ صلصلۃ علی صفوانٍ فاذا فُزِّعَ من قلوبِہم قالوا ماذا قالَ ربکم؟ قالوا الحق وھو العلی الکبیر" (یعنی جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم دیتا ہے تو فرشتے اپنے پَر پھڑپھڑاتے ہیں جو گویا تسلیم کرنے کی نشانی ہے۔ اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسی زنجیر پتھر پر کھینچنے سے۔ پھر جب ان کے دلوں سے وہ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے تو نیچے کے فرشتے اوپر والے بڑے فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا حکم دیا گیا ہے؟

[1] سورۂ مؤمن : ۵ ـ ۸

تو اوپر والے فرشتے کہتے ہیں کہ جو حکم بھی دیا گیا ہے وہ سچ ہے اور اللہ تعالےٰ بہت بلند اور بڑا ہے! اور اس کے بعد وہ تفصیل بتا دیتے ہیں۔ ایک اَور روایت میں ہے کہ "اذا قضیٰ امرا سبح حملة العرش ثم یسبح اھل السماء الذین یلونھم حتی یبلغ التسبیح اھل ھذہ السماء الدنیا، ثم قال الذین یلون حملة العرش لحملة العرش ماذا قال ربکم فیخبرونھم ماذا قال فیستخبر بعض اھل السموٰت بعضا حتی یبلغ الخبر اھل ھذہ السماء" (یعنی جب اللہ تعالےٰ کوئی نیا حکم دیتا ہے تو وہ فرشتے جو عرش کو تھامے ہوئے ہیں سبحان اللہ کہتے ہیں۔ پھر اُن سے ملے ہُوئے آسمان والے فرشتے سبحان اللہ کہتے ہیں یہاں تک کہ زمین کے قریب کے آسمان تک تسبیح پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد حاملین عرش کے قریب کے فرشتے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کیا فرمایا ہے؟ تو وہ انھیں بات بتا دیتے ہیں۔ اسی طرح نیچے کے آسمان والے اوپر کے آسمان والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں یہاں تک کہ نیچے دُنیا کے آسمان تک بات پہنچ جاتی ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اَور روایت میں فرماتے ہیں کہ "انی قمت من اللیل فتوضأت وصلیت ما قدر لی فنعست فی صلاتی حتی استثقلت فاذا انا بربی تبارک وتعالیٰ فی احسن صورة فقال یا محمد! قلت لبیک رب! قال فیم یختصم الملأ الاعلیٰ؟ قلت لا ادری قالھا ثلاثا۔ قال فرأیتہ وضع کفہ بین کتفی حتی وجدت بردا نامله بین ثدیی فتجلی لی کل شیء وعرفت فقال یا محمد! قلت لبیک رب! قال فیم یختصم الملأ

الاعلیٰ ؟ قلتُ فی الکفارات - قال وما ھن ؟ قلتُ مشی الاقدام الی الجماعات والجلوس فی المساجد بعد الصلوات واسباغ الوضوء حین المکروہات قال ثم فیم ؟ قال قلتُ فی الدرجات - قال وما ھن ؟ قلتُ اطعام الطعام ولین الکلام والصلوٰۃ باللیل والناس نیامٌ" (یعنی ایک روز میں کچھ رات گئے اُٹھا وضو کیا اور جس قدر موقع مجھے میسر آیا میں نے نماز پڑھی - پھر نماز ہی میں مجھے اُونگھ آگئی - یہاں تک کہ میرا دماغ بھاری ہو گیا ناگاہ دیکھا کہ میرا پروردگار نہایت اچھی شکل میں میرے سامنے ہے - مجھ سے فرمایا کہ اے محمد ! میں نے عرض کیا اے پروردگار ! میں حاضر ہوں - فرمایا کہ ملاءاعلیٰ کس بات پر بحث کر رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا - اللہ تعالیٰ نے یہی بات تین دفعہ فرمائی اور میں نے تینوں دفعہ یہی جواب دیا پھر میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دی - یہاں تک کہ اسکی انگلیوں کی ٹھنڈک میرے سینے میں محسوس ہونے لگی - اب مجھ پر سب چیزیں روشن ہو گئیں اور میں سب کچھ سمجھ گیا - اب پھر اللہ تعالیٰ نے پکارا اے محمد ! میں نے عرض کیا لبیک (حاضر ہوں) پوچھا ملاء اعلیٰ کس بات پر بحث کر رہے ہیں ؟ میں نے عرض کیا کہ کفارات پر بحث ہو رہی ہے ؛ فرمایا کفارے کیا چیز ہیں ؟ میں نے عرض کیا جماعت کی طرف پیدل چل کر جانا - نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اور تکلیف کے باوجود وضو کرنا - اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور کس بات پر بحث ہو رہی ہے ؟ میں نے عرض کیا درجے حاصل کرنے کی چیزوں پر - فرمایا وہ کیا ہیں ؟ میں نے عرض کیا کہ بلا شرط کھانا کھلانا (یعنی مسکین اور محتاج ہونے کی

شرط نہ ہو بلکہ ہر ایک کو عام اجازت ہو (اس لئے کہ بعض غیرت والے لوگ محتاجوں کے زمرے میں آنا پسند نہیں کرتے) اور ہر ایک انسان سے نرم بات کرنا اور راتوں کو ایسے وقتوں میں نماز پڑھنا جب لوگ سوئے ہوئے ہوں، (یعنی قوت والے انسان کے لئے بڑے کاموں سے ملاء اعلیٰ میں پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ مگر جو انسان قدرتی طور پر کمزور ہیں کیونکہ قدرت کی طرف سے انھیں پورا سامان نہیں ملا اُن کے لئے ملاء اعلیٰ میں پہنچنے میں کونسی چیزیں کام دیں گی؟ اس مسئلے کو ملاء اعلیٰ حل نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ بعض کام جو ظاہر میں چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اگر انھیں پابندی کے ساتھ کیا جائے تو کافی محنت کرنی پڑتی ہے مگر ان کاموں میں کوئی ظاہری شان و شوکت نہیں ہے اس لئے کمزور انسانوں کے لئے یہ پابندی بھی بڑا درجہ پیدا کر دیتی ہے جو جہاد اور دوسرے اعلیٰ کام طاقتور انسانوں کے لئے پیدا کر دیتے ہیں، جو شخص اس طرح مسجدوں میں جاتا ہے اور نماز پڑھنے کے بعد تمام شغل چھوڑ کر وہاں کچھ دیر بیٹھتا ہے وہ وہاں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو قرآن وغیرہ ہی سکھائے گا یا دین کی کوئی اَور بات بتائے گا۔ ایسے کام بڑی محنت والے کاموں سے کوئی کم درجہ نہیں پاتے۔ لیکن یہ باتیں فرشتے طے نہیں کر سکتے اس لئے تجلی اعظم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کام لیا آپ نے حظیرۃ القدس میں پہنچنے کے لئے طاقت والے لوگ جو بڑے بڑے اجتماعی کام کرتے ہیں ان کے مقابلے میں کمزوروں کے لئے

کون سے کام معین کئے ؟ وہ محتاجوں کو کھانا کھلانا، نرم بات کرنا اور سوتے کے وقت نماز پڑھنا ہے۔ ایک طرف تو ان میں سوسائٹی کو جمع کرنے کی قوت ہے، دوسری طرف ان سے اللہ سے سیدھا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ ان کاموں پر ہمیشہ قائم رہنے والے آدمی کا اوّل درجے کی ترقی کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ یہ بھی آنحضرت صلعم کے سوا کوئی فرشتہ نہیں بتا سکتا تھا) +

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ "ان اللہ اذا احب عبدًا دعا جبرائیل فقال : انی احبّ فلانًا فاحبّہ قال فیحبہ جبرائیل ثم ینادی فی السماء فیقول ان اللہ یحب فلانًا فاحبّوہ فیحبہ اھل السماء ثم یوضع لہ القبول فی الارض؛ واذا ابغض عبدًا دعا جبرائیل فیقول انی ابغض فلانًا فابغضہ قال فیبغضہ جبرائیل، ثم ینادی فی اھل السماء ان اللہ یبغض فلانًا فابغضوہ قال فیبغضونہ ثم یوضع لہ البغضاء فی الارض" (یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے پیار کرتا ہے تو جبرائیل کو بلا کر اس سے کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو پیار کرتا ہوں تو بھی اسے پیار کر۔ چنانچہ جبرائیل بھی اس سے پیار کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمانوں میں منادی ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص کو اللہ تعالےٰ پیار کرتا ہے تم سب بھی اسے پیار کرو۔ چنانچہ تمام آسمانوں والے اُس سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین پر اُسے مقبولِ عام بنا دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جب اللہ تعالےٰ کسی شخص کو ناپسند کرتا ہے تو جبرائیل کو بُلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص کو پسند نہیں کرتا تو بھی ناپسند کر،

چنانچہ جبرائیل اُسے ناپسند کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمانوں میں مُنادی کرا دی جاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ فلاں شخص کو پسند نہیں فرماتا تم سب بھی اس شخص کو ناپسند کرو۔ پھر وہ سب فرشتے اسے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین میں اُس کی ناپسند کئے جانے کی حالت پیدا کر دی جاتی ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "الملائکۃ یصلّون علی احدکم مادام فی مجلسه الذی صلی فیه یقولون اللھم ارحمه اللھم اغفرله اللھم تب علیه مالم یوذ فیه مالم یحدث فیه"۔ (یعنی جب تم نماز پڑھتے ہو اور اس کے بعد اُس مجلس میں بیٹھے رہتے ہو تو فرشتے تمہارے لئے دُعا کرتے رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یا اللہ اس پر رحم کر اسے بخش دے اس کی توبہ قبول فرما۔ جب تک تم وضو نہیں توڑتے اُس وقت تک یہی حالت قائم رہتی ہے)

نیز آپ فرماتے ہیں۔ کہ ما من یوم یصبح العباد فیه الا وملکان ینزلان فیقول احدھما اللھم اعط منفقًا خلفًا ویقول الاخر اللھم اعط ممسکاً تلفاً (یعنی ہر روز جب انسان صبح کے وقت اُٹھتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے یا اللہ! اچھی جگہ خرچ کرنے والوں کو اَور دے اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ نقد کو روک رکھنے والے کو ہلاکت دے) یعنی روپیہ دست بدست چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسے خزانہ بنانا اور روکنا جُرم ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان مفت میں دولت

لٹاتا پھرے بلکہ تجارت کرے۔ روپیہ کمائے تو اس پر بھی رحمت ہوگی۔ اس لئے کہ اس سے ہزاروں آدمیوں کی روزی کھل جائے گی۔ اگر وہ روپیہ بند کر دیتا ہے تو فرشتے اس فعل کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کے لئے بد دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح بہت سے لوگوں کی روزی رُک جاتی ہے)

فرشتے اور اُن کا کام واضح رہے کہ شرعی علموں میں یہ بات کثرت سے بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ایک خاص قسم پیدا کی ہے۔ وہ بزرگ فرشتے ہیں جو اللہ کے حضور میں قریب رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت خُدا نے ایسی بنائی ہے کہ جو شخص اپنی طبیعت میں شائستگی پیدا کرے اور اُسے مہذّب بنالے اور سوسائٹی کو شائستہ بنانے کی کوشش کرے اُسکے لئے ہمیشہ دُعا کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی دُعا کام کرنے والوں پر بہت سی برکتوں کے نازل ہونے کا سبب بنتی ہے۔ وہ ہر اُس آدمی پر جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اور سوسائٹی کو بگاڑنے کی کوشش کرے لعنت کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی لعنت سے سب سے پہلے تو اُس آدمی کے دل میں حسرت اور ندامت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اتنے ہی پر اپنے آپ کو نہ سنبھالے اور بُرے کاموں میں لگا رہے تو پھر وہ فرشتے ملاء سافل (نچلے درجے کے فرشتوں) کے دلوں میں یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ اس بُرے آدمی سے بُغض اور دشمنی رکھیں اور اُس کی دُنیا کی زندگی میں، عام قانون کے اندر جس قدر ہو سکے، اسے تکلیف دیں اور جب طبعی موت سے اس کے بدن

کا پردہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت جس قدر تکلیف دے سکتے ہیں دیں +
یہ فرشتے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان پیغام پہنچانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے حکم اُس کے بندوں تک اور بندوں کے کاموں کا خلاصہ (رپورٹ) اللہ تعالےٰ تک پہنچاتے ہیں۔ یہ فرشتے انسانوں کے دلوں میں نیک کام کرنے کے "خطرات" (کسی کام کے کرنے کا جو ہلکا ہلکا سا خیال پیدا ہوتا ہے اسے خطرہ کہتے ہیں۔ یہ خطرات مل کر جب پختہ ہو جاتے ہیں تو "ارادہ" بن جاتے ہیں) پیدا ہونے کا کسی نہ کسی طرح سبب بنتے ہیں۔ (یعنی جیسے روشنی دیکھنے سے خاص قسم کے "خطرات" دل میں گزرتے ہیں اور سمندر اور کھلا میدان اَور طرح کے خطرات پیدا کرتا ہے۔ ویسے ہی جب یہ فرشتے انسانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انسانوں کی طبیعتوں میں اچھے کام کرنے کے خطرات پیدا ہوتے ہیں۔ ان فرشتوں کے کام اور اثر کا نمونہ کسی بڑے کامل انسان کی صحبت میں بیٹھ کر نظر آتا ہے۔ جب وہ اپنی توجہ انسان کے قلب (دل) پر ڈالتا ہے تو اُس کے دل میں وہ خیال پیدا ہوجاتا ہے جو وہ توجہ دینے والا پیدا کرنا چاہتا ہے) +

فرشتوں کا اجتماع: ملاءِ اعلیٰ | یہ فرشتے آپس میں جمع ہوتے ہیں، لیکن کہاں اور کیسے؟ اس کی کیفیت ہم بیان نہیں کر سکتے۔ البتہ جہاں اور جیسے اللہ چاہتا ہے وہ جمع ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کے لحاظ سے انھیں تین

نام دیے جاتے ہیں :-

(۱) رفیق الاعلیٰ

(۲) ندی الاعلیٰ

(۳) ملاء الاعلیٰ

انسانوں میں سے بزرگ لوگوں کی رُوحوں کو بھی ان میں شامل ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ اور وہ بھی ان فرشتوں کے کاموں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یا ایھا النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربك راضیة مرضیة، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی، (یعنی اے اطمینان والی رُوح! تُو راضی اور خوش ہو کر اپنے ربّ کی طرف متوجہ ہو پھر میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں آجا) +

(اس آیت میں "میرے بندوں میں داخل ہو جا" میں جو اشارہ ہے وہ انہی بندوں کی طرف ہے جو حظیرۃ القدس اور ملاءِ اعلیٰ میں داخل ہو جاتے ہیں) +

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ مَیں نے جعفر ابن ابی طالب (حضرت علیؓ کے بھائی) کو دیکھا کہ (فرشتہ بن کر) دوسرے فرشتوں کے ساتھ جنّت میں اُڑا پھرتا ہے۔ اُس وقت اُس کے دو پَر تھے +

اللہ کے حکم پہلے کہاں نازل ہوتے ہیں؟ | یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ملاءِ اعلیٰ وہ

جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم پہلے پہل نازل ہوتے ہیں۔ اور وہیں ہر ایک جماعت کی ڈیوٹی مقرر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں کہ فِیْھَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْم (ہر ایک حکمت کا کام اس رات یعنی لیلۃ القدر میں تقسیم ہو جاتا ہے) اسی طرف اشارہ ہے +

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں انسانی سوسائٹی کے لئے اللہ کا قانون ایک درجے تک مقرر ہوتا ہے +

ملاءِ اعلیٰ کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) نورانی فرشتے | پہلی قسم ان فرشتوں کی ہے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم میں مقرر ہے کہ جن اصول پر یہ ساری کائنات پیدا کی گئی ہے اُن کے مجموعی تقاضے کے مطابق اچھا نظام اِن کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس نظام کے چلانے کے لئے ان فرشتوں کا وجود ضروری ہے۔ یہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ ویسا ہی نور ہے جیسے حضرت موسیٰؑ نے آگ دیکھی تھی۔ جس میں اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آواز سُنی تھی۔ ان نورانی جسموں میں اللہ تعالیٰ نے بہت بزرگ رُوحیں داخل کر دی ہیں +

(۲) مثالی فرشتے | عالمِ مثال میں عناصر کے لطیف بخارات جمع ہونے اور اُن کے ترکیب پانے سے ایسا جسم بن جاتا ہے جس سے اعلیٰ رُوح کام لے سکتی ہے۔ وہ روح حیوانی خصلتوں کو اپنے سے دُور پھینکتی ہے (یعنی یہ فرشتے پہلی قسم کے فرشتوں کے زیادہ قریب ہیں۔ اور ان سے

تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی ساخت میں مادی ملاوٹ بھی ہے اس لئے یہ انسانوں کے ساتھ بھی ایک قسم کا تعلق رکھ سکتے ہیں۔ انسان کا دماغ اور ذہن ان فرشتوں سے اثر لے سکتا ہے۔ نورانی فرشتے اس قسم کا واسطہ نہیں بن سکتے۔ یہ گویا مادے اور غیر مادے کے بیچ میں واسطہ ہیں جیسے انسان کی دماغی قوتیں انسان کے مادی جسم اور ذہن کی غیر مادی قوتوں کے درمیان واسطہ ہیں ورنہ غیر مادی قوتیں مادی دماغ سے کام نہیں لے سکتیں۔ وہ اس واسطے کے ذریعے سے دماغ سے کام لیتی ہیں۔ ایسے ہی نورانی فرشتے مادی انسان کے ساتھ براہ راست تعلق قائم نہیں کرسکتے اور نہ وہ نظام ان تک پہنچا سکتے ہیں جو نوع انسان کی ترقی کے لئے ضروری ہے)+

(۳) انسانی روحیں | تیسری قسم میں وہ انسانی روحیں داخل ہیں جو اتنی صاف ہوتی ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ سے علم لے سکتی ہیں۔ انھوں نے ایسے اچھے کام کیے جن کی وجہ سے وہ ملاء اعلیٰ کی بات سمجھنے کے قابل ہو گئے اور جب موت نے ان کا مادی ڈھانچہ ان سے الگ کر دیا تو وہ سیدھے ملاءِ اعلیٰ سے جا ملے اور انہی کی جماعت میں گنے جانے لگے +

ملاءِ اعلیٰ کے کام | ملاءِ اعلیٰ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف ایسی گہری توجہ سے لو لگائے رکھیں کہ دوسری چیز کی طرف توجہ کرنے سے وہ خیال ذرہ بھر بھی کم نہ ہو سکے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا

کہ یسبحون بحمد ربھم ویؤمنون بہٖ (یعنی وہ اپنے پروردگار کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور ہر دم اُسی کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگے رہتے ہیں) +

دوسرا کام یہ ہے کہ کائنات میں یا انسانیت میں جو اچھا نظام پیدا ہوسکتا ہے اُس کی خوبی بھانپ جائیں۔ اور اگر کہیں غلط نظام پیدا ہوگیا ہو تو اُس کی خرابی اور بُرائی دل سے محسوس کریں۔ اُن کا اِس طرح سمجھنا اللہ تعالےٰ کی رحمت کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی قرآن حکیم کی اس آیت کا مطلب : ویستغفرون للذین اٰمنوا (جو لوگ اللہ تعالےٰ کے احکام ماننے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں اُن کی غلطیوں کے لئے اللہ سے بخشش مانگتے ہیں) +

حظیرۃ القدس | ان میں سے بڑے بڑے فرشتے اور بڑے انسانوں کی رُوحیں جمع ہوتی ہیں تو ان کے نور آپس میں مل کر ایک چیز بن جاتے ہیں اور یہ اُس روح کے پاس ہوتا ہے جس کی تعریف میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ "اُس کے بہت سے منہ اور زبانیں ہیں۔" (یہی وہ وجود ہے جسے ہم "انسان اکبر" یا "امامِ نوعِ انسان" کہتے ہیں) نوروں کے اس اجتماع کا نام حظیرۃ القدس ہے +

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسانوں کی جماعتوں کی بہت بڑی بڑی غلطیوں کی وجہ سے انسان کی معاشی زندگی اور اُخروی زندگی (مرنے

کے بعد کی زندگی جس کے لئے انسان اس دنیا میں تیاری کرتا ہے) کے سلسلے میں نہایت خوفناک مصیبت اور تباہی پیدا کرنے والے حالات جمع ہو جاتے ہیں۔ حظیرۃ القدس میں جمع ہونے والے فرشتے اور روحیں اس تباہی اور مصیبت سے بچنے کا ایک طریق سوچتے ہیں۔ اور سب کا اس پر اتفاق ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ انسانوں تک پہنچایا جائے۔ اس کام کے لئے وہ انسان چنا جاتا ہے جو اس زمانے میں سب انسانوں میں سے زیادہ پاکیزہ روح کا مالک ہو (کیونکہ وہی یہ پیام قبول کرنے سمجھنے اور اسے عمل میں لانے کے قابل ہوتا ہے) پھر اس کی بات کو لوگوں میں پھیلانے اور چلانے کے لئے لوگوں کو مدد دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو انسان اس قسم کے الہامات قبول کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اُن کے دلوں میں الہام آنے شروع ہو جاتے ہیں کہ اس آدمی کی پیروی کریں۔ اس طرح وہ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ جو انسانیت کی خدمت کے لئے نمونے کے طور پر پیدا کی جاتی ہے۔ اُن کے اس اتفاق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن باتوں میں اُس قوم کی بھلائی اور بہتری سوچی جاتی ہے وہ اُس پاکیزہ روح والے انسان کے دل میں کبھی تو وحی کے ذریعے سے کبھی خواب کی حالت میں اور کبھی غیبی آواز کی شکل میں ڈالی جاتی ہیں۔ اس اتفاق کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے اس پاکیزہ انسان کو دکھائی دیتے ہیں۔ اُس سے روبرو بات کرتے ہیں۔ اور اسی اتفاق کا

نتیجہ ہوتا ہے کہ اس انسان کے دوستوں اور حامیوں کی مدد کی جاتی ہے۔ اور انہیں ہر اچھے کام کے کرنے کی طاقت مل جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے روکیں ان سے مدد روک لی جاتی ہے۔ اور وہ ایسے کام کرنے لگ جاتے ہیں جو خود انھیں تکلیف دیں۔ دنیا میں نبوّت کے پیدا ہونے کے جتنے قاعدے ہیں یہ ان کے لئے بنیادی قاعدہ ہے۔

روح القدس کی مدد کیا ہے؟ | ملاء اعلیٰ کا اتفاق اور اتحاد جس کسی بات پر جاری رہے تو اس طرح جو لگاتار مدد کسی انسان کو ملتی رہتی ہے اس کا نام روح القدس کی تائید ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے لوگ عام حالات میں واقف نہیں ہوتے۔ انھیں معجزات کہتے ہیں +

ملاءِ سافل کے فرشتے | ملاءِ اعلیٰ کے نورانی فرشتوں سے دوسرے درجے پر اللہ تعالیٰ نے ایسی روحیں پیدا کی ہیں جن کے بدن لطیف مادی بخارات کے اعتدال مزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پہلے درجے کے (نورانی) فرشتوں کے مرتبے کے نہیں ہوتے۔ ان کا حال یہ ہے کہ یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں سوچتے بلکہ اوپر سے علم یعنی حکم آنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اتنی ہی بات لے سکتے ہیں جتنی ان میں سمجھ ہو اور جتنی اوپر کے فرشتے انھیں سمجھا سکیں۔ پھر جو نہی انھیں کوئی بات سمجھائی جاتی ہے وہ جھٹ اسے پورا کرنے کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس میں اپنی پوری طاقت

کر دیتے ہیں جیسے پرندے اپنی طبعی خواہش سے کام کرتے ہیں۔ اور یہ طبعی الہام اُن کی طبیعت بن جاتا ہے۔ اِسی طرح یہ فرشتے مشینی پُرزوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی ذاتی نفع یا نقصان کو سامنے رکھ کر کام نہیں کرتے۔ فقط وہی بات عمل میں لاتے ہیں جس کا انھیں اوپر کے فرشتوں کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ یعنی اُن کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ یہ فرشتے انسانوں اور حیوانوں کے دلوں میں "خطرات" (ہلکے ہلکے ارادے) پیدا کرتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر کے فرشتوں کو انسانی اجتماع (سوسائٹی) میں جو کام پُورا کرنا ہوتا ہے اُس کے پورا کرنے کے ارادے انسانوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں +

یہ نچلے درجے کے فرشتے بعض چیزوں کی حرکتیں تبدیل کرنے میں بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ جیسے کسی آدمی نے کوئی پتھر لڑھکایا اور فرشتے نے اپنا اثر ڈالا تو وہ اتنی دُور تک لڑھکتا چلا جاتا ہے جتنی دُور تک عام طور پر نہ جاتا۔ اِسی طرح جب کوئی شخص مثلاً مچھلی پکڑنے کے لیے اپنا جال پانی میں ڈالتا ہے تو ان فرشتوں کی فوجیں اُن مچھلیوں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی مچھلی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ آگے بڑھے اور جال میں چلی جائے۔ اور کسی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ بھاگ جائے۔ وہ جال کی کسی رسّی کو سکیڑتے ہیں کسی کو ڈھیلا کر دیتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ تو فقط اوپر کے فرشتوں کی "تحریک" کے مطابق

کام کرتے ہیں۔ یا مثلاً کسی موقعے پر دو جماعتوں میں لڑائی ہو جاتی ہے تو یہ فرشتے وہاں پہنچ کر موقع کے مناسب ایک جماعت کے دلوں میں تو بہادری، ثابت قدمی اور غلبے کی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں، چنانچہ غلبہ حاصل کرنے کے طریقے اُن کے دلوں میں ڈالتے ہیں، پتھر وغیرہ پھینکنے میں انکی مدد کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اور دوسری جماعت کے دلوں میں کمزوری اور بُزدلی کے خیالات پیدا کر دیتے ہیں تاکہ وہ نتیجہ نکلے جو اللہ نکالنا چاہتا ہے یعنی وہ جماعت غالب آئے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق غالب آنی چاہئے اس طرح اُس کے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُنہیں الہام ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو تکلیف پہنچاؤ یا آرام اور راحت پہنچاؤ تو یہ فرشتے اِس بارے میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہ ملاءِ سافل کے فرشتے کہلاتے ہیں +

شیطانی قوتیں ملاءِ سافل (نچلے درجے کے فرشتوں) کے مقابلے میں ایسی جماعتیں ہیں جن کی طبیعتوں میں ہلکا پن اور بے چینی بھری ہوئی ہے وہ ایسے خیالات کے مالک ہوتے ہیں جو نیکی کے بالکل برخلاف ہوتے ہیں۔ یعنی اچھے نظام سے ٹکراتے ہیں۔ اِن روحوں کے جسم تاریک بخارات کی سڑاند سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ شیاطین کہلاتے ہیں۔ ملاءِ سافل کے فرشتے جو کام کرتے ہیں یہ شیاطین ہمیشہ انھیں بگاڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ (یہ تیسرے درجے کی مخلوق کا جنھیں جنّات کہتے ہیں، ناقص حصہ ہیں) +

چوتھا باب (۴)

اللہ تعالےٰ کا قانون یا سُنّتُ اللہ

چوتھا باب (۴)

اللہ تعالےٰ کا قانون یا سُنّتُ اللہ

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالےٰ کے بعض کام ایسے ہیں کہ جب تک بعض قوتیں، جو اس کائنات میں پیدا کی گئی ہیں اپنا کام نہ کرلیں اللہ تعالےٰ کے وہ کام عمل میں نہیں آتے (یعنی کائنات کی فطرت میں علّت و معلول کا جو سلسلہ رکھا ہے وہ اپنا عمل کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ اُس کی رعایت رکھ کر کام کرتا ہے) اِس مسئلے پر نقلی شہادت بھی موجود ہے اور عقلی بھی +

نقلی شہادتیں | چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا۔ جو اُس نے زمین کے ہر ایک حصّے سے جمع کی تھی یہی وجہ ہے کہ آدم کی اولاد اس مٹی کے موافق مختلف رنگوں کی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی ان میں سے سُرخ، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی اُن کے درمیان ہوتا ہے ایسے ہی اس مٹی کا اثر ان کے اخلاق پر پڑا۔ کوئی نرم مزاج ہے کوئی سخت، کوئی بد باطن، کوئی صاف دل +

عقلی شہادتیں | کون شخص ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک انسان کا مارنا تلوار کی ضرب یا زہر کے کھانے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور غلّے اور درخت بیج بونے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب تک انسان میں کسی کام کے کرنے کا "بیج" نہ ہو اُسے شرعی حکموں کے ماننے کا ذمّہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ اور اُسے یہ نہیں کہا جاتا کہ یُوں کرو اور یُوں نہ کرو۔ جس کام کے کرنے کی طاقت فطرت نے اُس میں رکھی ہوئی ہے۔ فقط اُس کے مطابق جزا دی جاتی ہے۔ یہ قوتیں کئی قسم کی ہیں :-

(۱) عناصر کی خاصیتیں اور ان کی طبیعتیں ÷

(۲) ہر ایک جاندار بلکہ ہر ایک بے جان جنس مثلاً لوہا، سونا وغیرہ کی ایک خاص شکل و صورت رنگت اور وزن مخصوص ہے۔ اُس شکل کو اُس کی جنس کی صورتِ نوعیہ (Generic Form) کہتے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ نے ہر ایک چیز کی صورتِ نوعیہ (Generic Form) میں جو خاصیتیں رکھی ہیں ان کے مطابق ہی اُسے عملوں کی جزا ملتی ہے +

(۳) زمین پر کسی چیز کے پیدا ہونے سے پہلے عالمِ مثال میں اُس چیز کا جو وجود ہوتا ہے اُس کا اثر +

(۴) ملاءِ اعلیٰ کی دُعائیں - جو وہ پُوری ہمت سے اُس شخص کیلئے مانگتے ہیں جس نے اپنے آپ کو شائستہ بنا لیا ہو - یا لوگوں میں شائستگی پھیلانیکی کوشش کر رہا ہو یا جو شخص سوسائٹی میں اچھا نظام جاری کرنیکی کوشش کا محتاج ہو اُسکے حق میں ملاءِ اعلیٰ کی بد دعائیں - اس سے بھی کسی شخص یا جماعت کے عملوں کی جزا مترتب ہوتی ہے،

(۵) بنی آدم کے لئے کسی قانون کا معین ہو جانا - اور اس کے ماتحت کسی کام کا ضروری اور کسی کا منع ہو جانا - کیونکہ یہ قانون اور اس کے ماتحت حلال و حرام کا تعین بھی اس قانون کے ماننے والوں کیلئے اچھے پھل اور نہ ماننے والوں کے لئے بُرے پھل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے +

(۶) کسی امر کے متعلق اللہ تعالےٰ کا فیصلہ جب اس فیصلے کو جاری کرنا ہوتا ہے تو یہ فیصلہ چاہتا ہے کہ فلاں بات بھی پیدا ہو اس لئے کہ اللہ کی سنّت یا قانون کے مطابق وہ دوسری چیز اس فیصلے کے ساتھ لازم ہوتی ہے کیونکہ خدا تعالےٰ کے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ مختلف باتوں میں علت اور معلول کا جو سلسلہ قائم کیا گیا ہے اُسے توڑ دیا جائے +

اسباب میں تکرار اور حکمتِ الٰہی | جن اسباب سے عام قانون قدرت کے مطابق

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بنتا ہے۔ اگر وہ آپس میں ٹکرا جائیں اور سب کا تقاضا ایک وقت میں پورا نہ کیا جا سکے تو حکمت کا تقاضا یہ ہوگا کہ جو چیز مصلحتِ عامّہ کے زیادہ قریب ہو اُسے مقدّم رکھا جائے اور اُسے عمل میں لایا جائے۔ باقی باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ مصلحتِ عامّہ کے مطابق سب سے زیادہ مناسب چیز کو ترجیح دینے کے قاعدے کا نام میزان ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ "اللہ کے ہاتھ میں میزان ہے۔ وہ ایک پلڑے کو اُونچا کرتا ہے اور دُوسرے کو نیچا کرتا ہے"۔ اسی کا نام "شان" بھی ہے۔ جیسے قرآن میں آتا ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ (اللہ ہر نئی شان میں ہے)۔

ترجیح دینے کے بھی بہت سے قاعدے ہیں۔ کبھی اس طرح دی جاتی ہے کہ جو زیادہ طاقتور قوت ہوئی اُسے آگے کر لیا۔ کبھی دو قوتوں میں سے زیادہ نفع اور فائدہ دینے والی قوت کو مقدّم کر لیا۔ خواہ وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں مصلحتِ خلق اور مصلحتِ تدبیر میں اختلاف ہو وہاں مصلحتِ خلق کو تدبیر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی صورتیں ہیں۔ ہم اگرچہ اُن سب اسباب کو نہیں جانتے جو اِس کائنات میں کام کر رہے ہیں۔ اور نہ یہ جانتے ہیں کہ جب دو سبب آپس میں ٹکرائیں تو کس سبب کو کس طرح ترجیح دی جائے۔ مگر اتنا ضرور

جانتے ہیں کہ جو چیز وجود میں آتی ہے وہ ان قاعدوں میں سے گزر کرہی وجود میں آتی ہے اور وہ وجود میں آنے کے قابل ہوتی ہے جبھی اُسے ترجیح دے کر وجود میں لایا جاتا ہے۔ جو شخص اِن مسئلوں کو اس طرح سوچے گا وہ اُن بہت سی مشکلوں کو جو نظامِ قدرتِ الٰہی سمجھنے میں پیش آتی ہیں سمجھ لے گا۔ یعنی کہیں یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی کہ فلاں چیز قدرت الٰہی سے ہوگئی گو اس کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اِس طرح کی باتوں سے حکیموں سے جو ایک قسم کی جنگ ٹھن جاتی ہے وہ نہ ہوگی)٭

اب سوال یہ ہے کہ ستاروں اور سیاروں کی شکلوں میں انکے آپس میں کسی خاص شکل میں واقع ہونے سے بھی کوئی سبب پیدا ہوتے ہیں جن سے اللہ تعالےٰ کام لیتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آسمانی اجرام کا ایک اثر تو اِس قسم کا ہے جیسے موسموں کا بدلنا۔ کبھی سردی کا آنا کبھی گرمی کا۔ اور دن رات کا چھوٹا بڑا ہونا جس کا تعلق سورج اور زمین کی پوزیشن سے ہے یا سمندر میں مدّ و جزر کا آنا جس کا تعلق زیادہ تر چاند کی پوزیشن سے ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب ثریّا نکل آتی ہے تو پھلوں سے آفت دُور ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قانونِ قدرت اس طرح واقع ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے فقیر یا امیر ہونے میں یا کسی اجتماع انسانی میں قحط پڑنے یا فراخی ہونے اور اسی قسم کے دوسرے انسانی اجتماع کے حادثات کو ستاروں کی حالتوں سے کوئی تعلق نہیں جسے شریعت تسلیم کرتی ہو۔ بلکہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی باتوں پر گہرا غور کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ من اقتبس شعبۃً من النجوم اقتبس شعبۃً من السحر (یعنی جو شخص نجوم کے علم کا کوئی حصّہ بھی حاصل کرتا ہے وہ گویا جادو کا ایک حصّہ حاصل کرتا ہے) اور یہ لفظ کہنے سے تو بڑی سختی سے منع کردیا گیا ہے کہ بارش اس لئے ہوئی کہ فلاں ستارہ نکلا تھا (یعنی اسلام اس تصوّر سے روکتا ہے کہ بارش وغیرہ طبعی حوادث کو ستاروں سے منسوب کیا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ ستاروں کی ان خاصیتوں کی نفی کرتی ہے جن سے ہمارے کرۂ ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے بعض حادثات واقع ہوتے ہیں جیسے سورج کے داغوں کے اثر سے نباتات کے نشوونما پر اثر پڑتا ہے یا سورج کے اندر مقناطیسی طوفان کے پیدا ہونے سے ہمارے کرۂ ہوا کے مقناطیسی اور برقی مجموعے پر اثر پڑتا ہے اور اس کا اثر انسانوں اور حیوانوں کی عام صحت پر پڑتا ہے) چنانچہ نبی اکرم صلعم نے کاہنوں کی سی باتیں کرنے یا انھیں ماننے سے بھی صاف لفظوں میں منع فرمادیا ہے۔ (کاہن کی خبروں سے مُراد وہ خبریں جو وہ کہتے ہیں کہ وہ جنّوں کے ذریعے حاصل کرکے پہنچاتے ہیں) اس کے باوجود جب آپؐ سے کہانت (کاہنوں کے فن) کا حال پوچھا گیا تو آپؐ نے اس کی تشریح یوں کی کہ فرشتے فضاءِ کائنات میں نیچے اُترتے ہیں تو جو فیصلہ ملاءِ اعلیٰ میں ہو چکا ہوتا ہے اُس کا

آپس میں ذکر کرتے ہیں۔ اب جو جنّات اور شیاطین اُس فضا تک پہنچ جاتے ہیں وہ وہاں سے یہ باتیں چوری چوری سُن لیتے ہیں اور وہی کاہنوں کو آکر بتا دیتے ہیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ سَو جھُوٹ ملا لیتے ہیں +

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ یا ایھا الذین اٰمنوا! لا تکونوا کالذین کفروا و قالوا لاخوانھم، اذا ضربوا فی الارض او کانوا غزًّا، لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا (یعنی اے مسلمانو! تم کافروں کی طرح مت بن جاؤ جو اپنے بھائیوں سے، جب وہ سفر کے لئے نکلنا چاہیں یا جنگ میں جا رہے ہوں، کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ قتل ہوتے) گویا سفر اور جنگ کے لئے نکلنے کو اُن کی مَوت سے کوئی تعلق نہیں ہے +

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو اُس کا عمل جنّت میں نہیں لے جائے گا۔ حالانکہ عملوں ہی کے سبب سے انسان جنّت میں جاتا ہے۔ لیکن یہاں عمل کی تاثیر کا انکار نہیں ہے بلکہ انکار اِس چیز کا ہے کہ اجر دینے والے خدا کو بھُول کر انسان سیدھا اپنے عملوں ہی کو سبب مان بیٹھے +

آنحضرت صلعم نے ایک شخص سے جو طبیب تھا فرمایا کہ انّما انت رفیق والطبیبُ ھو اللہ (یعنی تو ہمارا ہی ساتھی ہے شفا دینے والا طبیب تو اللہ ہی ہے) گویا طبیب کو طبیب ماننے سے انکار کر دیا گیا

ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اصل میں طبیب نہیں ہے یا دوا
کا استعمال نہیں جانتا بلکہ فقط یہ کہ وہ شفا حاصل کرنے میں سیدھا سبب
نہیں ہے بلکہ صرف ایک ذریعہ ہے +

پانچواں باب (۵)

روح کی حقیقت

پانچواں باب (۵)

رُوح کی حقیقت

انسانی رُوح " انسانِ اکبر کا عکس ہوتی ہے جو حظیرۃ القدس میں موجود ہے - یہ عکس سب سے پہلے عالمِ مثال میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس میں اُن سب چیزوں کا نمونہ آجاتا ہے جو " انسانِ اکبر" سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ حظیرۃ القدس کے فرشتوں کی روحانی طاقت کا بھی پرتو آجاتا ہے۔ ستاروں اور سیّاروں کی جو حالتیں کائنات پر اثر ڈالتی ہیں اُن کا عکس بھی موجود ہوتا ہے اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ "انسانِ اکبر" کے دل پر جو تجلّی الٰہی پڑتی ہے اُس کا بھی عکس آ جاتا ہے چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر آتا ضرور ہے +

جب "انسانِ اکبر" کی رُوح کا عکس عالمِ مثال کے تختے (کاغذ) پر بیٹھ جاتا ہے۔ اُسے "ملکوتی روح" کہا جاتا ہے۔ پھر جسمانی دُنیا میں انسانی بدن کے ذریعے ایک لطیف ہَوا تیار کی جاتی ہے جو اس ملکوتی رُوح کے لئے "سواری" (مطیّہ) بن سکتی ہے۔ وہ ہَوا جو جسمانیت کا خلاصہ ہوتی ہے اور ملکوتی رُوح کا "جسم" یا "سواری" بنتی ہے اُسے "رُوحِ حیوانی" کہا جاتا ہے۔ یہ "رُوحِ حیوانی" نہ "ملکوتی رُوح" کے ساتھ پُوری پُوری مطابقت رکھتی ہے نہ جسمِ انسانی کے ساتھ۔ بلکہ بالکل تیسری چیز ہوتی ہے۔ اسے نَسمہ بھی کہا جاتا ہے۔ اور ملکوتی رُوح کا دوسرا نام نفسِ ناطقہ بھی ہے۔ جس طرح "روحِ حیوانی" ملکوتی رُوح کی سواری ہے اسی طرح انسانی جسم حیوانی رُوح کا گھوڑا یا سواری ہے۔ جسد یا جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد رُوح حیوانی اپنی ہستی کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس کی اندرونی طاقتوں کی ترقّی اور ان کے نتیجوں کا نام ہمارے اعمال کی جزا یا سزا رکھا گیا ہے +

کیا ہمیں رُوح کا علم کم دیا گیا ہے؟ قرآنِ حکیم میں آتا ہے کہ ویسئلونک عن

الرُّوح: قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (یعنی تجھ سے رُوح کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ روح خُدا کے حُکم کی ایک چیز ہے اور تمہیں اس کے علم میں سے بہت تھوڑا حصّہ دیا گیا ہے) اِس آیت کو حضرت عبداللہ ابن مسعود نے وَمَا اُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا بھی پڑھا ہے۔ اس صُورت میں اس کے معنی ہُوئے کہ اِنہیں یعنی پوچھنے والے (یہودیوں) کو رُوحانی علم کا بہت تھوڑا حصّہ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "تھوڑا علم" دئے جانے کا خطاب یہودیوں سے ہے جنھوں نے رُوح کی حقیقت پوچھی تھی۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلعم کی اُمّت میں سے بھی کسی کو رُوح کی حقیقت کا علم نہیں ہوسکتا جیسے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو چیز شریعت بیان نہ کرے اُس کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بات کسی کی سمجھ میں آہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ عام لوگ اسے نہ سمجھ سکتے ہوں اس لئے اس کے بیان سے خاموشی اختیار کی گئی ہو۔ لیکن خاص لوگوں کو اس کا علم ہوسکتا ہے +

رُوح عامیانہ نقطۂ نگاہ سے جب انسان رُوح کی حقیقت پر غور کرنے بیٹھتا ہے تو جو بات اُسے سب سے پہلے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ روح حیوان میں زندگی کا منبع ہے۔ جب تک اُس میں رُوح رہتی ہے وہ زندہ ہے اور جب رُوح اُس سے الگ ہو جاتی ہے تو وہ مرجاتا ہے +

رُوح کی حقیقت اس کے بعد زیادہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کے بدن میں قلب کے ذریعے سے ایک لطیف بخار پیدا ہوتا ہے جس میں بدن کی تمام خلطوں (Humour) کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اس میں محسوس کرنے اور ہلنے جلنے کی طاقت بھی ہوتی ہے اور بدن کے اندر جو قوتیں تدبیر کرتی ہیں انھیں بھی یہ بخار سنبھال سکتا ہے۔ اطبا اپنی کتابوں میں اسی رُوح کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ طبّی تجربے سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے کاموں پر اس بخار کے لطیف یا کثیف ہونے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسان کے بدن کے ایک ایک عضو کو بیماری آتی ہے اور اس بخار کے پیدا ہونے کو جو چیز روکتی ہے اس کا سیدھا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس بخار کے کام پریشان ہو جاتے ہیں۔ یعنی جتنی آفتیں انسان پر آتی ہیں وہ اس بخار کے کام کو بے قاعدہ بنا دیتی ہیں۔ جبتک یہ بخار باقاعدہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ زندگی قائم رہتی ہے اور جب یہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ تحلیل ہو جاتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔

انسان زیادہ گہرا غور نہ کرے تو اس بخار ہی کو رُوح کہتا ہے۔ لیکن زیادہ غور کیا جائے تو یہ بخار روح کا نچلا طبقہ قرار پائے گا۔ اسکی مثال ہمارے بدن میں ایسی ہے جیسے گلاب کے اندر گلاب کا عرق یا کوئلے کے اندر آگ۔ جب اس سے بھی زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ روح حقیقی روح کے لئے سواری کا کام دیتی ہے یا اُس کے لئے

مادّے کا کام دیتی ہے جس کے ساتھ تعلّق پیدا کر کے ہی وہ کام کر سکتی ہے +

اس حقیقی رُوح پر یُوں غور ہو سکتا ہے کہ ایک بچّے کو دیکھتے ہیں کہ وہ جوان ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کی بدنی قوتیں اور اُن سے پیدا ہونے والی رُوح (بخار یا نسمہ) ہزارہا مرتبہ بدلتا رہتا ہے بچّہ ایک وقت میں چھوٹا ہوتا ہے پھر بڑا ہوتا ہے کبھی اُس کا رنگ سفید ہوتا ہے کبھی سیاہی مائل۔ وہ ایک وقت میں جاہل ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں عالم۔ اسی طرح اور بہت سی حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آتی ہیں اور وہ سب انسان میں کسی نہ کسی وقت پائی جاتی ہیں۔ اِن صفتوں کی تبدیلی ہوتے ہوئے بھی انسان ہمیشہ ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم زیادہ کُریدیں تو کہنا پڑتا ہے کہ تبدیلیاں ہوتے ہوئے بھی بچّہ وہی کا وہی رہتا ہے یعنی صفتیں بدلتی رہتی ہیں مگر بچّہ وہی کا وہی رہتا ہے۔ اس لئے یہ "بدلنے والی صفتیں" اور "بچّہ" ایک نہیں ہو سکتے بلکہ بچّہ "اَور" ہے اور صفتیں اَور ہیں۔ اب ہماری رائے یہ ہے کہ جس چیز سے انسان کی یہ اکائی قائم ہے وہ یہ لطیف بخار تو ہو نہیں سکتا اور نہ وہ یہ بدن ہو سکتا ہے بلکہ حقیقی رُوح ایک غیر مرکّب چیز ہے جو ایک نورانی نقطہ ہے۔ اس کا طرز اور انداز جسمانی طرز اور انداز سے بالکل الگ ہے +

جسمانی چیزوں میں بعض اپنی ذات سے قائم ہیں انھیں جوہر کہتے

ہیں بعض دُوسری چیزوں کے ساتھ قائم ہیں اُنھیں عرض کہتے ہیں۔ یہ حقیقی رُوح جسمانی جوہر اور عرض سے الگ ہی کوئی چیز ہے۔ یہ رُوح جس حالت میں چھوٹے کے ساتھ ہے اُسی حالت میں بڑے کے ساتھ ہے اور جس حالت میں سیاہ کے ساتھ ہے اُسی حالت میں سفید کے ساتھ ہے۔ غرض ہر حالت میں اس کا تعلق ایک جیسا ہی ہے۔ اس روح کا سیدھا تعلق روح ہوائی کے ساتھ ہے اور رُوح ہوائی کا تعلق بدن کے ساتھ ہے +

حقیقی روح اصل میں ایک سوراخ ہے جس میں سے اوپر کے عالم (عالمِ قدس) کی چیزیں روح ہوائی یا نسمے پر اُس کی طاقت کے مطابق اُترتی ہیں۔ پس جس قدر تبدیلی ہمیں انسان میں نظر آتی ہے اس کا اصل سبب اس کا بدن ہے۔ جیسے جب دھوبی دھوپ میں کپڑا دھوتا ہے تو کپڑے کا رنگ تو سفید ہو جاتا ہے لیکن دھوبی کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گویا سورج کی تاثیر کپڑے اور دھوبی پر ان کی اپنی اپنی استعداد (قابلیت) کے مطابق پڑتی ہے +

موت کیا ہے؟ | یہ بات ہمارے صحیح وجدانی علم[1] میں ثابت ہو چکی ہے کہ

---

[1] علم کی دو قسمیں کرنی چاہئیں جو علم انسان اپنی کوشش سے خود حاصل کرتا ہے اسے "اکتسابی" کہتے ہیں اور جو خدا تعالےٰ کی طرف سے سیدھا حاصل ہوتا ہے اسے "وجدانی علم" کہتے ہیں + (مرتب)

موت کے وقت نسمہ بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ بدن میں یہ طاقت ہی نہیں رہتی کہ وہ نسمے کو پیدا کر سکے۔ موت کے وقت حقیقی روح (روحِ قدسی) نسمے سے جدا نہیں ہوتی۔ اگر اتفاق سے انسان ایسی بیماریوں کا شکار ہو جائے جن سے نسمہ یا روحِ ہوائی گھٹتی رہے تو بھی تھوڑی سے مقدار باقی رہ جاتی ہے۔ جس کے ساتھ روحِ الٰہی یا روحِ قدسی کا تعلق قائم رہتا ہے اور اس طرح انسان کی انسانیت محفوظ رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے شیشی میں سے ہوا چوس کر نکال لی جائے۔ تو اس طرح چوس کر نکالنے کی بھی ایک حد ہے اس سے زیادہ نہیں نکل سکے گی۔ جب اتنی چوسی جائے کہ شیشی ٹوٹ جائے تو بھی ہوا کی تھوڑی سی مقدار اس کے اندر باقی رہ جاتی ہے۔ یہ ہوا کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح نسمے کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ گھٹتا گھٹتا بہت گھٹ جاتا ہے (تحلیل ہو جاتا ہے) لیکن پھر بھی اتنا سا جز یا حصہ باقی رہ جاتا ہے جس کے ساتھ روحِ حقیقی کا تعلق قائم رہتا ہے۔

موت کے بعد کی حالت | جب انسان مر جاتا ہے۔ یعنی نسمہ بدن سے جدا ہو جاتا ہے تو یہ گویا اس کی نئی پیدائش ہوتی ہے۔ یعنی عالمِ مثال کے اس طبقے میں جہاں وہ اب جاتا ہے اسے نئی شکل میں ڈھالا جاتا ہے اب روحِ الٰہی عالمِ مثال کی قوتوں کی مدد سے نسمے کی باقی رہی ہوئی قوت کو طاقت بخشتی ہے جس کے سبب سے حواس کا مجموعہ، دیکھنے کی طاقت

سُننے کی قوت اور بولنے کی طاقت کام دینے لگتی ہیں (مثالی قوت سے وہ چیز مراد ہے جو مادّے اور غیر مادّے کے بیچ میں ہے اور ساری کائنات میں ایک چیز کی طرح پھیلی ہُوئی ہے) اس وقت نسمہ عالم مثال کی قوتوں کی مدد سے انسان کے کاموں کے ان نتیجوں کے اثر کے مطابق جو نسمے میں محفوظ ہوتے ہیں۔ روشن یا سیاہ لباس اختیار کر لیتا ہے۔ یہ لباس گویا مادی بدن کی جگہ کام دیتا ہے۔ اس مثالی جسد (جسم) سے قبر اور حشر کے عجیب عجیب واقعات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر جب صُور پھونکا جائے گا، جس کا مطلب یہ لینا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ کا جو صورتیں پیدا کرتا ہے، ایک فیض جاری ہوگا۔ اس فیض کی طرح جو پیدائش شروع کرتے وقت جاری ہُوا تھا، اسی قسم کا فیض اب محشر میں جاری ہوگا۔ اس فیض کے اثر سے روح الٰہی ایک پورا جسمانی لباس حاصل کریگی یا ایسا لباس ہوگا کہ اس میں مثالی اور جسمانی دونوں قسم کی قوتیں برابر کام کر رہی ہونگی، اس وقت وہ سب باتیں پیش آئینگی جن کی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے +

ملکیت اور بہیمیت | نسمہ، اصلی روح اور مادی بدن کے درمیان ایک چیز ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ اس میں دونوں قوتیں ہوں۔ چنانچہ اس میں ایک قسم کی قوتوں کا رُخ روحِ الٰہی کی طرف ہے۔ اسے ملکیت (فرشتہ پن) کہتے ہیں اور دوسری قسم کی قوتوں کا رُخ مادی بدن کی طرف ہے۔ اس رُخ کو بہیمیت (حیوانیت) کہتے ہیں +

رُوح کی اَور حقیقت کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم یہاں زیادہ بیان

کرنا نہیں چاہتے ۔ ان باتوں کو مان ہی لینا چاہیئے اور جو نتیجے ہم پیدا کرنا چاہیں انھیں سمجھتے رہنا چاہیئے یہاں تک کہ اس علم سے ایک اور اونچے درجے کے علم میں ان باتوں پر سے پردہ اُٹھا دیا جائے[1]۔

---

[1] شاہ صاحبؒ نے اس اُونچے درجے کے علم کا کچھ حصہ اپنی کتاب "الخیر الکثیر" میں بیان فرمادیا ہے ۔

چھٹا باب (۶)

انسان کیلئے قانون کی پابندی کی ضرورت

(۶)

چھٹا باب

انسان کیلئے قانون کی پابندی کی ضرورت

قانون کی پابندی کا انتظام ایک جماعت کے ذریعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور وہ حکومت کرنے والی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ قانون کا انتظام کرنے والی جماعت کا فرض ہے کہ وہ امانت دار ہو اور اپنا فرض ادا کرنے والی ہو +

صحیح طور پر قانون کی پابندی کرانے والی جماعت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ قانون کی تعلیم عام لوگوں کو اس طرح دنیا

شروع کرے جیسے باپ اپنی اولاد کو بڑھاتا ہے۔ پھر قانون کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دینا بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ وہ مخالف جماعتیں یا تو اس پارٹی کے اندر ہوں گی یا باہر۔ جو اندر ہوں گی، اُنہیں قانون توڑنے کی سزا دینے کا نام "تعزیر" ہے اور جو باہر ہونگی ان سے جنگ کرنی پڑے گی۔ تعزیر اور جنگ دونوں میں جتنی قوت استعمال کرنی ضروری ہے اتنی ہی استعمال کرنی چاہیئے +

یہ قانون چلانے والی پارٹی عام لوگوں سے فقط قانون کی پابندی کرائے گی اور ان کی طرح خود بھی اس قانون کی پابندی کرے گی۔ وہ ان سے اپنی خواہشوں کی پیروی نہ کرائے گی کیونکہ یہ ظلم ہے +

قانون کی صحیح پابندی کے لئے عربی زبان میں اصطلاحی لفظ "تکلیف" بولا جاتا ہے +

امانت سے کیا مُراد ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا لِیُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَیَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (یعنی ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی۔ ان سب نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس سے گھبرا گئے۔ فقط انسان نے اسے قبول کیا اور وہ اس کے لائق بھی تھا کیونکہ یہ ظلوم اور جہول ہے اللہ تعالیٰ

کو منظور تھا کہ یہ نظام ضرور قائم ہو تاکہ اللہ تعالےٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر بار بار رحمت برساتے اور اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے) +

امام غزالیؒ اور بیضاوی اور دوسرے بڑے بڑے عالموں نے اشارہ کیا ہے کہ اس آیت میں امانت سے مراد قانون صحیح طور پر چلانے کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فرمانبرداری کی حالت میں ثواب اور نافرمانی کی حالت میں عذاب قبول کر لینا۔ اور یہ جو قرآن حکیم میں آیا ہے کہ ہم نے یہ "عہد پیش کیا" تو اس سے مراد یہ ہے کہ ذمہ داری اور کام کرنے کی قابلیت کو ملا کر دیکھا گیا کہ آیا یہ کام ان سے ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ "انھوں نے انکار کیا" تو اس سے مراد یہ نہیں کہ انھوں نے منہ سے "نہیں" کہا بلکہ اُن کا طبعی انکار مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ طبعی طور پر یہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ "انسان نے یہ بوجھ اُٹھا لیا" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں یہ کام کرنے کی قابلیت اور استعداد ہے یعنی وہ کر سکتا ہے +

"ظلوم" اور "جہول" کے معنی | اس طرح سوچنے کے بعد قرآن حکیم کے الفاظ "اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوماً جَھُولاً" گویا حکمت ظاہر کرنے والے الفاظ بن جاتے

ہیں اس لئے کہ ظلوم وہ شخص ہوتا ہے جو عدل اور انصاف کر سکتا ہو اس میں اس کی قابلیت اور اہلیت ہو لیکن انصاف اور عدل کرے نہیں۔ اور جہول اسے کہتے ہیں جسے علم نہیں ہے لیکن وہ علم حاصل کر سکتا ہے

انسان کے سوا جتنی مخلوقات ہے وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے

(۱) ایک حصہ تو وہ ہے جو طبعی طور پر علم اور عدل رکھتے ہیں یعنی وہ عالم اور عادل ہیں بلکہ وہ غیر عالم اور غیر عادل ہو ہی نہیں سکتے جیسے فرشتے۔

(۲) دوسری وہ مخلوق جو نہ عالم ہے نہ عادل اور نہ وہ علم اور عدل سے کام لے سکتی ہے۔ جیسے حیوانات پس اس عہد کے قبول کرنے کی ذمہ داری اس مخلوق پر آ پڑتی ہے۔ جو علم اور عدالت کر سکے گو یہ دونوں صفتیں اس وقت موجود نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ انسان کے سوا ایسی کوئی مخلوق نہیں ہے۔

امانت قبول کرنے کا نتیجہ | قرآن حکیم میں آگے چل کر جو آیا ہے کہ لیعذب المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات (تاکہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے) تو اس میں پہلے لفظ میں جو لِ ہے وہ عاقبت یا انجام یعنی نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالے فرماتا ہے کہ اس امانت کے قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کو عذاب اور ثواب ملے گا۔

امانت اور فرشتے | اگر انسان اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہے، تو اُسے چاہیئے کہ وہ پہلے فرشتوں کا خیال کرے۔ ان میں بہیمیت بالکل نہیں ہے جیوانی قوت کی کمی سے جو حالتیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے بھوک، پیاس، خوف اور غم وغیرہ یا اس کی زیادتی سے جو حالتیں پیدا ہوتی ہیں جیسے غضب، فخر وغیرہ ان میں سے کوئی چیز ان میں نہیں ہے اور نہ انہیں کھانے پینے اور سونے کی حاجت ہے۔ ان کی طبعی حالت یہ ہے کہ اُوپر سے جو حکم نازل ہو اسے عمل میں لانے کے لئے ہر وقت فارغ رہتے ہیں یعنی انہیں کوئی چیز مشغول نہیں رکھتی۔ سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی باتوں کو عمل میں لاتے رہیں۔ ایک بات کرلی، پھر دوسری کا انتظار کرنے لگے، وہ کرلی تو پھر تیسری کا انتظار کرنے لگے۔ جب انہیں اُوپر سے کوئی حکم آتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسانی سوسائٹی میں کوئی اچھا انتظام قائم کیا جائے یا کسی خاص شخص سے اللہ تعالیٰ خوش ہے یا ناخوش ہے، اس قسم کے الہام سے وہ بالکل بھر جاتے ہیں۔ یعنی وہ اس الہام سے پورا پورا اثر لے کر اسے عمل میں لانے کے لئے بالکل تیار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر پوری طاقت سے اُسے پورا کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں ان کے سامنے اپنا کوئی ذاتی کام نہیں ہوتا۔ وہ فقط اُوپر سے آئے ہوئے حکم کے پورا کرنے میں

لگ جاتے ہیں۔

امانت اور حیوانات | اب اس کے بعد انسان جانوروں کے حال پر غور کرے۔ کہ وہ کس طرح بہت نیچے درجے کی باتوں یعنی کھانے پینے وغیرہ ہی میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہر وقت اپنی طبعی خواہشوں میں پھنسے رہتے ہیں وہ ان کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ فقط وہ کام کرتے ہیں جن میں اُن کے بدن کا کوئی فائدہ ہوتا ہو یا ان کے حیوانی تقاضے کو پُورا کرنے والی کوئی چیز ہوتی۔

امانت اور انسان | اس کے بعد دیکھئے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان میں دونوں باتیں رکھ دی ہیں:۔

(۱) اس کے اندر فرشتوں کی سی طاقت بھی ہے۔ جو اس روح کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان ہی میں پائی جاتی ہے۔ اور کسی حیوان میں پائی نہیں جاتی، وہ انسان کے سارے جسم میں پھیلی ہوتی ہے اور انسان کی روح طبعی یعنی نسمہ اس رُوح الٰہی کے تابع ہوکر کام کرتا ہے۔

(۲) اس کے اندر حیوانوں کی سی طاقت بھی ہے جو اس کی حیوانی رُوح میں سے نکلتی ہے۔ یہ حیوانی روح تمام حیوانوں میں ایک جیسی ہے۔ اس میں انسان کی ساری کی ساری طبعی قوتیں موجود ہیں۔ اور وہ اپنی پختہ ہستی رکھتی ہے۔ اور انسان کی اصلی رُوح بھی

اس کے اثر سے اثر لیتی ہے +

ان دونوں قوتوں ـــــ ملکیّت اور بہیمت ـــــ میں ٹکراؤ ہے۔ چنانچہ قوّت ملکیہ یعنی فرشتوں کی قوّت انسان کو اوپر کی طرف ترقی دینا چاہتی ہے۔ اور بہیمت نیچے کی طرف۔ اگر بہیمت غالب آجائے تو ملکیّت چھپ کر رہ جاتی ہے +

اللہ تعالےٰ کی ایک حکمت | یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ کائنات میں جو بھی نظام پیدا ہوتا ہے یعنی بہت سی مختلف چیزیں مل کر ایک بن جاتی ہیں۔ اس نظام میں کام کرنے کی جو طاقت اور اثر قبول کرنے کی جو استعداد ہوتی ہے، خواہ وہ اس نظام کی اصلی اور ذاتی ہو یا اس نے کما کر حاصل کی ہو، اس استعداد کے مطابق اللہ تعالےٰ کی طرف سے مدد دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی ایک شان ہے۔ اس قاعدے کے مطابق انسان نے جو بطور خود ایک نظام ہے۔ اگر حیوانی باتیں زیادہ جمع کرلیں اور ان کو عمل میں لانا چاہا تو انہیں مکمل کرنے کے لئے اللہ نے اس کائنات میں جو سامان پیدا کر رکھا ہے، وہ اُسے مل رہتا ہے۔ اور اگر اس نے فرشتوں کی سی باتیں جمع کرلی ہیں اور ان سے کام لینا چاہتا ہے تو اس کائنات میں اس کے لئے بھی پورا پورا سامان پیدا کر دیا ہے۔ اس سے اُسے مدد ملتی رہے گی۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ فَاَمَّا

مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی، فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی، وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی، فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی (یعنی اس کے بعد جو شخص دیتا ہے اور انصاف کے قانون کی پابندی کرتا ہے اور صحیح تر بات کو مانتا ہے۔ ہم اس کے لئے اُس کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص بخل کرتا ہے اور انصاف کے قانون کی پابندی سے بے پروائی رکھتا ہے۔ اور صحیح بات کو جھٹلاتا ہے اُس کے لئے ہم تنگی کا راستہ آسان بنا دیتے ہیں ۹۲: ۵-۱۰)

ایک اور جگہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ کُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (یعنی ہم دونوں قسم کی جماعتوں کو مدد دیتے ہیں اور انہیں یہ مدد اللہ کی طرف سے عطیہ ہے۔ اور اللہ کا عطیہ کسی سے روکا نہیں جاتا۔ ۱۷: ۲۰)

لذّت اور الم کیا ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ملکی اور بہیمی قوتوں میں سے ہر ایک قوت کی دو حالتیں ہیں۔ اگر اس قوت کے موافق چیزیں علم میں آتی جائیں تو اُسے لذّت کہا جاتا ہے اور اگر مخالف چیزوں کا علم ہوتا رہے تو اُسے درد (الم) کہا جاتا ہے۔ پس انسان کی ان دونوں قوتوں کے مطابق لذّت اور درد علیحدہ علیحدہ ہوتے +

انسان کی موجودہ حالت اس زندگی میں انسان کی حیوانی قوت غالب ہے اور انسان کی حالت ایسی ہے جیسے اس نے بدن میں احساس کو کمزور کرنے والی کوئی دوا (مخدّر) استعمال کر رکھی ہو۔ اس مخدّرہ

(احساس کو کمزور کرنے والی چیز) کے استعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ آگ کا شعلہ اُسے لگے تو بھی اُسے درد محسوس نہیں ہوتا۔ اور اُس کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب اس مخدّر کا اثر جاتا رہتا ہے۔ اور جب طبیعت اپنی اصلی حالت پر آجائے تو درد پورے زور سے محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح ملکیت کے تقاضوں کے خلاف کام کرنے سے جو درد محسوس ہونے چاہئیں وہ حیوانیت کے "کلوروفارم" کے غلبے کے سبب سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے موت کے بعد حیوانی قوت کا کلوروفارم اُتر جائے گا۔ تو ملکیت کے خلاف جس قدر غلطیاں کی جا چکی ہیں وہ ایک ایک کر کے محسوس ہونے لگیں گی ؛

انسان کی اس مدہوشی کی حالت کی دوسری مثال گلاب کے پھول کی ہے۔ اطبّاء کہتے ہیں کہ گلاب میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں :-

(۱) ایک قوت زمینی ہے۔ اگر گلاب کو خوب اچھی طرح گھس کر لگایا جائے تو اس قوت کا اثر ظاہر ہوتا ہے ؛

(۲) دوسری قوت پانی کی طرح ہے وہ نچوڑنے سے حاصل ہوتی ہے ؛

(۳) تیسری قوت ہوا کی طرح ہے۔ وہ سونگھنے سے حاصل

ہوتی ہے +

اسی طرح انسان کی حیوانی قوت اس زندگی میں ظاہر ہوتی ہے اور ملکی قوت چھپی رہتی ہے۔ اور ملکی قوت مرنے کے بعد کی زندگی میں ظاہر ہوگی +

شریعت انسان کے لئے طبعی چیز ہے

ہماری اس تمام بحث سے ظاہر ہوگیا۔ کہ انسان کو کسی قانون کا پابند بنانا خود انسان کی نوع کی فطرت کا تقاضا ہے۔ گویا انسان کے اندر جو استعداد رکھی گئی ہے وہ زبانِ حال سے مانگتی ہے کہ جو حکم قوت ملکی کے مناسب ہیں، وہ اُس پر لازم کردیئے جائیں اور پھر اُس کا بدلہ اُسے پُورا پُورا دیا جائے۔ یعنی اس کا پورا پورا نتیجہ اُس کے نسمے کے اندر محفوظ رہے۔ اور حیوانی زندگی میں پھنس کر رہ جانا اس کے لئے حرام کردیا جائے۔ اور اگر وہ پھنس جائے تو اس طرح جو کام کرے اُس کی سزا اُسے دی جائے۔ واللہ اعلم +

ساتواں باب

انسانی ذمہ داری کی پیدائش اُس کی تقدیر سے

ساتواں باب (۷)

انسانی ذمہ داری کی پیدائش اُس کی تقدیر سے

(۱) ایسی معین چیزیں جن کی طرف اشارہ کیا جا سکے "اشخاص" کہلاتی ہیں۔ جیسے عمرو، زید، بکر، گھوڑا، بیل وغیرہ +

اگر "اشخاص" کی ایک جماعت میں کوئی بات ایسی ہو کہ وہ سب میں پائی جاتی ہو تو جتنے اشخاص میں وہ بات پائی جاتی ہو وہ سب مل کر نوع کہلاتے ہیں۔ جیسے زید، بکر، عمرو وغیرہ میں

ایک بات پائی جاتی ہے۔ جس کے سبب سے انہیں انسان کہا جاتا ہے۔ اور گھوڑوں میں سے ہر ایک میں ایک بات پائی جاتی ہے۔ جس کے سبب سے انہیں گھوڑے کہا جاتا ہے۔ پس زید، بکر، عمرو وغیرہ کی ایک نوع ہے۔ اور گھوڑوں کی دوسری نوع +

پھر مختلف نوعوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اگر ان میں کوئی بات ایسی ہو کہ وہ سب نوعوں میں پائی جائے تو ایسی سب نوعوں کے مجموعے کو جن میں وہ خاص صفت پائی جاتی ہو جنس کہا جاتا ہے۔ جیسے انسان، گھوڑے اور بیل میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے کہ یہ جاندار ہیں۔ اس لئے ہم کہیں گے کہ یہ سب مل کر حیوان کی جنس ہے +

اب اس سلسلے کو ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو تمام جنسوں میں جو بات ایک جیسی پائی جائیگی اس کے لحاظ سے جنسوں کے مجموعے کو جنس الاجناس کہا جائے گا +

(۲) اس عالم کی تمام کائنات (جو چیزیں موجود ہیں وہ) سب ایک تدبیر میں جکڑی ہوتی ہیں۔ اور کوئی چیز اس قاعدے سے باہر نہیں جا سکتی جو قدرت نے اس نظام کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اس میں علت و معلول کے سلسلے

مختلف طریقوں سے جمع ہو گئے ہیں۔ اور ایک نظام بن گیا
علّتوں کے یہ چھوٹے مجموعے بڑے نظام کے نیچے ہیں۔ اور
وہ انہیں اتنا آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ جو جی چاہیں نتائج پیدا کریں۔
اور اس طرح علّتوں کے دوسرے مجموعے سے ٹکرا جائیں۔
بلکہ علّتوں کے سب مجموعوں کے اوپر ایک بالائی نظام ہے۔
جو ان سب کی رفتار مقرر کرتا ہے۔ اس غالب اور زبردست
بالائی نظام کا نام تقدیر ہے +

الٰہیات کو ماننے والے سب عقلمند لوگ اور نبیوں
کی شریعتوں کے ماننے والے حکیم اس نظام کا مالک خدا
کو مانتے ہیں۔ نبیوں کی جماعت کا کوئی آدمی جب یہ کہتا ہے
کہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے تو اس جماعت کے عالم اس کا یہ
مطلب بتاتے ہیں کہ جس حکمت سے خدا نے یہ نظام چلانا
پسند کیا ہے ویسا ہی ہوگا۔ چونکہ اس نظام کو چلانا خدا
تعالیٰ کی ذات کا طبعی تقاضا ہے۔ اس لئے اس نظام میں
جو خوبی پائی جاتی ہے اُس کی تعریف اصل میں اللہ ہی کی
تعریف ہو سکتی ہے +

عام لوگ تقدیر کے لفظ کو کچھ اس طرح بولتے ہیں کہ اس
کے اندر اس حکمت کا اثر نہیں آتا جو اس لفظ کے پیچھے موجود

ہے لیکن خدا کے قانون میں عام لوگوں کے اس استعمال کی کوئی سند نہیں ہے۔ شریعتوں کے پختہ مغز عالم اور حکیم اس بارے میں ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ صرف رائے کے ظاہر کرنے والے لفظوں میں فرق ہو جاتا ہے۔

اس بڑے نظام کو تحلیل کیا جائے (یعنی اس کے اجزا بنا کر دیکھے جائیں) تو "جنس الاجناس" کا ایک قانون نکلے گا۔ اس کے بعد ہر جنس کے لئے علیحدہ علیحدہ قانون ہوگا۔ انسانی نوع کے لئے جو قانون ہے اُسے "شریعت" کہتے ہیں۔ تو اب جو لوگ شریعت کو تقدیر کے مقابلے میں لاتے ہیں ان کی عقلمندی باقی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ شریعت تو جیسے اوپر دکھایا گیا ہے۔ ساری کائنات کی تقدیر کے نیچے "نوع انسانی کی تقدیر" یا اس کے لئے قانون ہے۔ اگر یہ کائنات ایک نظام ہے اور ایک تدبیر کے ماتحت ہے تو اس کائنات کے ایک جزو کا قانون یا تقدیر کائنات کے باقی اجزا کی تقدیر سے ٹکرا نہیں سکتی۔ ٹکراؤ جو پیدا ہوتا ہے وہ اس لفظ کی پوری حکمت اور پورے معنی نہ سمجھنے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔

صورت نوعیہ کا قانون نباتات میں

واضح رہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو شرعی قانون کی پابندی کا جو حکم دیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ

کی حجت (دلیل) ایسی زوردار ہے کہ اس حکم کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں چھوڑتی۔ غور کرنے والا آدمی جب اپنے ارد گرد کی مخلوقات کو دیکھے گا اور یہ سوچے گا کہ اُن کی ساخت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کا قانون کس طرح چلایا ہے۔ تو وہ اصل حقیقت کو پالے گا۔ مثلاً درخت کو دیکھئے۔ اُس کے پتے ہیں، پھول ہیں، پھل ہیں اور دوسری صفتیں ہیں جو نظر آسکتی ہیں یا چکھ کر معلوم کی جاسکتی ہیں۔ ان پر پورا غور کیجئے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ہر ایک قسم کے درخت کے پتوں کی شکل وشباہت الگ الگ ہے۔ اُن کے شگوفے الگ الگ طرح کے ہیں۔ ہر ایک قسم کے درخت کے پھل کا ذائقہ الگ الگ ہے۔ ان چیزوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں قسم کا درخت ہے۔ یہ سب چیزیں — پتے، پھول پھل وغیرہ کی خاص خاص شکلیں۔ درخت کی صورتِ نوعیہ کے قانون کا نتیجہ ہیں اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں[1] جہاں یہ صورت

---

[1] آم کا درخت جہاں کہیں بھی پایا جائے گا اُس کے پتوں کی ایک خاص شکل ہوگی۔ اس کے پھول خاص رنگ و بو اور شکل کے ہوں گے۔ اُس کے پھل ایک خاص ذائقہ اور شکل اور قد و قامت لئے ہوئے ہوں گے۔ اس سب کا مجموعہ آم کا درخت ہے۔ یہ شکل اور حالت آم کے ہر ایک درخت کی ہوتی ہے۔ اس خاص شکل، حالت، ذائقہ، بو وغیرہ کے مجموعے کو صورتِ نوعیہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایسے ہی انسان کی ایک صورتِ نوعیہ ہے۔ گھوڑے کی دوسری صورتِ نوعیہ ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ١٧٦)

نوعیہ مقرر ہوتی ہے وہیں اُس کے ساتھ آنے والی خاصیتیں معین ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جب اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ فلاں مادہ کھجور بن جائے تو اس حکم کے اندر ہی یہ بات آگئی کہ اس کا پھل ایسا ہو اور اس کا شگوفہ ایسا ہو۔

نوع کے بعض خاصّے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر عقلمند اسے پہچان لیتا ہے۔ البتہ بعض خواص ایسے بھی ہوتے ہیں کہ عقلمند لوگ بہت سوچ بچار کے بعد ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے مشہور ہے کہ جو شخص اپنے پاس یاقوت رکھے اس کے دل میں ایک قسم کی فرحت اور شجاعت پیدا ہوگی۔ یاقوت کا یہ خاصّہ ہر ایک شخص غور کئے بغیر نہیں سمجھ سکتا۔

نوع کے بعض خاصّے ایسے ہوتے ہیں جو اُس نوع کے ہر ایک فرد میں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں۔ کہ اس نوع کے کسی فرد میں پائے جاتے ہیں کسی میں نہیں جن میں وہ خاصّے نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵) باقی مخلوق کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیئے۔ اب یوں کہا جائیگا کہ آم کی یہ شکل اس لئے ہے کہ آم کی صورتِ نوعیہ اسی شکل کا تقاضا کرتی ہے۔ اور سیب کی وہ شکل اس لئے ہے کہ سیب کے درخت کی صورت نوعیہ اسی شکل کا تقاضا کرتی ہے۔ پس سیب کے درخت کی سب خاصیتیں اُس کی صورتِ نوعیہ کی دی ہوئی ہیں (مرتب)

پائے جاتے۔ ان میں اس لیے نہیں پائے جاتے کہ اُن افراد میں ان خاصیّتوں کو قبول کرنے کا مادہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک قسم کی ہرڑ (ہلیلہ) ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اُسے ہاتھ میں لے لے۔ تو اُسے دست آنے لگیں گے (یہ تاثیر نہ ہر ایک ہرڑ میں پائی جاتی ہے اور نہ ہر ایک انسان پر اس کا اثر ایک جیسا ظاہر ہوتا ہے)+

یہ بات سمجھ لینے کے بعد کسی انسان کا حق نہیں رہتا کہ وہ اس قسم کا سُوال کرے کہ آم کا میوہ اس شکل کا کیوں ہوتا ہے۔ یہ نہایت نکمّا اور بے معنی سوال ہے۔ کیونکہ حکمت کے علم میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ کسی چیز کی خاصیتیں جس سبب سے پیدا ہوتی ہیں اُس سبب کے پائے جانے کے بعد یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ وہ خاصیّتیں کیوں پیدا ہو گئیں (یعنی جو چیز کسی چیز کا لازم نتیجہ ہو اور وہ چیز موجود ہو تو نتیجہ خواہ مخواہ موجود ہونا ہوا۔ جیسے جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین کی روشنی سورج سے آتی ہے۔ تو جب سُورج نکل آیا ہو تو یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ دُھوپ کیوں پیدا ہو گئی)

حیوانات میں اس کے بعد حیوانوں کی قسموں پر غور کیجئے۔ حیوانوں میں بھی ہر ایک نوع کی ایک خاص شکل اور خاص عادتیں ہیں۔ جیسے درختوں کی کیفیّت تھی۔ حیوانوں میں اختیاری حرکات بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کی طبیعتیں اپنے ماحول سے اثر بھی لیتی ہیں۔ جنہیں طبعی الہام کہا جاتا

ہے۔ اور اُن کے اندر طبعی تدبیر کام کرتی ہے جس سے اُس حیوان کی عادتیں بنتی ہیں۔ جیسے گائے کی جگالی کرنے کی عادت اس کے اندر کام کرنے والی خاص طبعی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ان اختیاری حرکتوں، طبعی الہاموں اور جبلّی تدبیروں کے لحاظ سے حیوانوں کی ایک نوع دوسری نوع سے ممتاز ہوتی ہے۔ مثلاً چوپائے گھاس چرتے ہیں۔ پھر اُن میں سے بعض جُگالی کرتے ہیں (جیسے گائے) اور بعض جُگالی نہیں کرتے۔ جیسے گھوڑا، خچّر اور گدھا۔ بعض جانور گوشت کھاتے ہیں۔ اور پرندے ہوا میں اُڑتے ہیں۔ مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں۔ ایسے ہی ہر نوع کے حیوانوں کی خاص خاص آوازیں ہیں جو دوسری نوع کے حیوانوں میں پائی نہیں جاتیں۔ (جیسے کوّے کی کائیں کائیں، گدھے کے ہنہنانے اور شیر کے دھاڑنے سے بالکل الگ قسم کی آواز ہے) ایسے ہی ان میں نر اور مادہ کے ملنے کا طریقہ ہے کہ ایک نوع کا طریقہ دوسری نوع کے طریقے سے الگ ہے۔ اسی طرح اولاد کی تربیّت کا قاعدہ ہر ایک نوع کا الگ الگ ہے۔ اس کی تفصیل کہاں تک بیان کی جائے؟ لیکن اسے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ ہر ایک نوع کے جیوانوں کو اتنا ہی علم دیا گیا ہے جتنا اُس کی طبیعت قبول کر سکتی ہے اور جتنا اُس کی زندگی اچھی طرح بسر کرنے کے لئے ضروری ہے

جیوانوں کو الہام کہاں سے ہوتا ہے؟ | یہ تمام الہامی تعلیمات. جو ہر جیوان کو حاصل ہوتی ہیں - اُن کے پیدا کرنے والے کی طرف سے صورتِ نوعیہ کے راستے آتی ہیں (یہ طبعی تقاضے جیوانوں کے لئے ویسے ہی ہیں) جیسے درختوں میں شگوفوں کے خطوط اور میووں کے مزے. جو اُن کی صورتِ نوعیہ کے ساتھ انہیں حاصل ہوتے ہیں (یعنی جیسے ہر قسم کے درخت کے خاص قسم کے پتّے شگوفے اور پھل ہوتے ہیں. ویسے ہی ہر ایک جیوان کی خاص عادتیں اور خصلتیں ہوتی ہیں - یہ چیزیں دونوں کو اس صورتِ نوعیہ کے ذریعے سے ملتی ہیں) جیوانوں میں بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو ساری نوع میں پائی جاتی ہیں - اور بعض ایسی ہیں کہ کسی فرد میں ہیں کسی میں نہیں جس جیوان کا مادہ اپنی نوع کی صورت کی خاصیتیں زیادہ قبول کرتا ہے اور اس کے اسباب بھی موجود ہوتے ہیں اس میں نوعی تقاضے پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں - اور جس میں مادہ ناقص پایا جاتا ہے - اُس میں وہ نوعی تقاضے پوری طرح نمایاں نہیں ہوتے اگرچہ اصل استعداد عام ہوتی ہے........ جیسے شہد کی مکھیوں میں رانی (کہ اگرچہ مکھی ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں لیکن رانی اُس "باپ" سے. بنتی ہے جس میں وہ خاص چیز موجود ہوتی ہے جو رانی بننے کے لیے ضروری ہے) ایسے ہی طوطا ہونے کے لحاظ سے سب طوطے برابر ہیں. لیکن وہ سب کے سب انسان کی آواز

کی نقل نہیں اُتار سکتے ایک خاص قسم کا طوطا ہوتا ہے - جو تعلیم اور مشق کے بعد انسان کی آواز کی صاف نقل اُتار سکتا ہے ◆

انسان کی ترقی کا راز | اب انسان کی نوع پر غور کرو - تو اُس میں وہ سب خاصیتیں ملیں گی جو درختوں میں ہیں اور وہ خاصیتیں بھی پائی جائیں گی جو حیوانوں میں ہیں - مثلاً کھانسنا، انگڑائی لینا، ڈکارنا، فضلہ خارج کرنا، پیدا ہوتے ہی بچے کا ماں کی چھاتیوں سے دُودھ پینے لگنا یہ سب حیوانی خواص ہیں جو انسان میں پائے جاتے ہیں) ان کے علاوہ چند وہ خواص بھی پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان دُوسرے حیوانوں سے اُونچے درجے کا گنا جاتا ہے - جیسے سوچ کر بات کرنا - بات کو سمجھنا اور اس کا سوچ کر جواب دینا - ایسی باتوں کو جو انسان اپنے حواس سے سمجھ لیتا ہے - اور جن کے سمجھنے میں اسے محنت نہیں کرنی پڑتی اور عقل نہیں کھپانی پڑتی، ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے سوچ کر نئے مسئلے اور نئے علم پیدا کرنا ایسے ہی تجربے کے ذریعے سے اور ایک ہی قسم کے نتیجے پیدا کرنے والے واقعات جمع کر کے اور تیزی کے ساتھ صحیح تخمینہ لگا کر نئے علوم پیدا کرنا - نیز انسان کے بڑے خواص میں سے ایک خاصّہ یہ بھی ہے کہ جن باتوں کی خوبی حواس اور تخیّل سے نہیں جان سکتا اُن کی

خوبی عقل سے پہچان لیتا ہے۔ پھر ان باتوں کو اپنی پوری قوت اور ہمت کے ساتھ پورا کرتا ہے۔ جیسے اپنے نفس کو درست کرنا اور (عدل قائم کرنے اور ظلم دور کرنے کے لیئے) ملک فتح کر کے اپنے حکم کے نیچے جمع کر لینا ۔

یہ چیزیں انسانی نوع کا خاصہ ہیں (ان چیزوں کا انسانی نوع کے خواص میں سے ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے۔ کہ تمام قومیں آپس میں بہت سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس بات کو مانتی ہیں کہ یہ باتیں اچھی ہیں۔ یہاں تک کہ اونچے اونچے پہاڑوں میں بسنے والی قومیں بھی ان خیالات سے خالی نہیں ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی صورتِ نوعیہ سے یہ عجیب بات پیدا ہوتی ہے جس نے ان باتوں کو ہر جگہ خوبی قرار دے دیا ہے۔ اس کا بھید یہ ہے کہ انسانی مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی عقل[۱] اس کے جذبوں[۲] پر غالب رہے اور جذبے اس کی طبعی خواہشوں[۳] پر غالب رہیں (دماغ عقل کا مقام ہے۔ قلب جذبات

---

[۱] عقل :۔ خیالات کا سلسلہ جس کے اجزا کے آپس میں ملانے سے نئی باتیں معلوم کی جاتی ہیں (مرتّب) [۲] جذبہ :۔ انسان کے ذہن کے اندر کی وہ قوت جو خیال اور تصوّر سے پیدا ہوتی ہے جو کسی کام پر اُکساتی ہے (مرتّب) [۳] طبعی خواہش : وہ خواہشیں جن کے اچھا یا بُرا ہونے کا فیصلہ عقل سے نہیں کرایا جاتا (مرتّب)

کا گھر ہے اور جگر طبعی خواہشوں کا مقام ہے۔ دیکھا جائے تو ان میں سے ہر ایک کا مقام اُس کا کام معین کرتا ہے۔ یعنی عقل جو دماغ میں ہے قلب سے اُونچی ہے۔ اس لیے اسے قلب یعنی جذبات پر غالب رہنا چاہیے)

ہر نوع کے لئے الگ تدبیر | اللہ تعالےٰ نے ہر نوع کے اندر کام کرنے والی جو تدبیریں مقرر کی ہیں اُن پر غور کیجیے اور سوچیے کہ ہر نوع کی تربیت اور پرورش کے لیے اللہ تعالےٰ نے اپنی نوازش اور مہربانی سے راستے کتنے آسان کر دیے ہیں +

نباتات میں تدبیر کی کارفرمائی | (۱) دیکھیے نباتات میں حواس اور ہلنے جُلنے کی طاقت نہیں۔ اس کی تربیت اور پرورش کا یہ سامان کیا کہ اس کی جڑیں پیدا کر دیں کہ وہیں اپنی جگہ رہتے ہوئے زمین میں سے ہوا پانی اور لطیف مٹی کا مجموعی مادہ چوس لیتی ہیں اور پھر ٹہنیوں وغیرہ میں اپنی صورتِ نوعیہ کے تقاضے کے مطابق تقسیم کر دیتی ہیں +

حیوانات میں تدبیر کی کارفرمائی | (۲) چونکہ حیوان کے حواس ہیں اور وہ حرکت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے اُسے جڑیں نہیں دیں جو مادے کو زمین سے چوسیں بلکہ اُس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ غلّہ گھاس اور پانی وغیرہ چل پھر کر، جہاں ملیں، وہاں سے حاصل کرے۔ اس طرح اسے جن جن ارتفاقات کی ضرورت تھی وہ اُس کے دل میں

ڈال دیے۔

بعض کیڑے مکوڑے زمین سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو اس طرح پیدا نہیں ہوتے اُن میں اللہ تعالٰے نے یہ تدبیر جاری کر دی ہے کہ وہ نر اور مادہ کے آپس میں ملنے سے بڑھیں اور مادہ میں وہ رطوبتیں ہیں جو پیٹ کے بچے کی پرورش میں لگتی ہیں پھر (دوسری منزل میں) وہی رطوبت بچے کے لیے دودھ بن جاتی ہے۔ پھر پیدا ہونے والے بچے کے دل میں الہام ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ پستانوں کو چوس کر دودھ نکلے۔ اسی طرح قدرتِ الٰہی نے مرغی میں ایسی رطوبت پیدا کر دی ہے جس سے انڈے بن جاتے ہیں۔ جب وہ انڈے دے دیتی ہے تو اس کا پیٹ خالی سا ہو جاتا ہے اور اُس کے بعد اُس کے دماغ پر خشکی سی چھا جاتی ہے۔ جو اُسے ایک طرح سے پاگل سی بنا دیتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے ملنا چھوڑ دیتی ہے اور کسی ایسی چیز کو سینے سے لگانا چاہتی

---

۵ حیوانات کو زندگی بسر کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے مثلاً کھانے پینے کی، سردی گرمی سے بچنے کی، پیاس بجھانے کی، ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی ترکیبیں مثلاً شکار کرنا، بھٹ یا گھونسلے بنانا وغیرہ ارتفاقات کہلاتے ہیں (مرتب)

جو اُس کے پیٹ کو دبائے رکھے۔ (اسی طرح قدرت نے کبوتروں کے نر اور مادہ میں اُنس پیدا کر دیا ہے۔ جب مادہ کا پیٹ انڈے سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ بھی انڈے سینا چاہتی ہے۔ پھر اُس کے اندر جو زائد رطوبت ہوتی ہے وہ قے کی شکل میں خارج کرتی ہے (یہ گویا بچے کو چوگا دینے کا طریقہ ہے) پھر مادہ کے دل میں اپنے بچے کے لیے محبّت پیدا کر دی جس کی وجہ سے وہ اپنی قے کو بچے کے مُنہ میں ڈال دیتی ہے۔ جس سے پانی اور دانہ اس کے اندر چلا جاتا ہے۔ اور نر کبوتر مادہ کی محبّت کی وجہ سے اُس کی پیروی کرتا ہے۔ اسی طرح کبوتر کے بچے کے بدن میں رطوبت زیادہ پیدا کر دی ہے جو اس کے پَر بنانے میں کام آتی ہے جن سے وہ اُڑتا ہے۔

نوع انسان میں تدبیر کی کارفرمائی (حیوانات کے بعد انسان کا درجہ آتا ہے) اُس میں حس اور حرکت بھی ہے۔ وہ طبعی اور جبلی الہامات بھی قبول کرتا ہے۔ اور ان کے علاوہ اس میں عقل بھی پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تجربے کے ذریعے سے نئی نئی باتیں معلوم کر سکتا ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کے دل میں زراعت کرنے، درخت لگانے۔ تجارت کرنے اور آپس میں لین دین کرنے کے طریقے الہام کیے ـــ ان میں بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی طبیعت

میں لیڈر بننے کا مادہ رکھا ہے یا وہ اتفاق سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض لوگ ایسے ہیں جن کی طبیعت میں ماتحتی کا مادہ رکھا ہوا ہے یا وہ اتفاق سے ماتحت بن جاتے ہیں بعض ایسے ہیں جن کو بادشاہ بنا دیا ہے اور بعض کو رعیت بنا دیا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی استعداد انہیں حکیم بنا دیتی ہے۔ پھر حکیموں میں سے کوئی حکیم الٰہیات کا ماہر ہے کوئی طبیعیات کا کوئی ریاضی کا ماہر ہے اور کوئی حکمت عملی کا۔ بعض لوگ طبعی طور پر کم سمجھ ہوتے ہیں اُن میں اس قسم کی حکمت کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف دوسروں کے پیچھے چل سکتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ باتیں تمام قوموں میں برابر پائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ جنگلوں میں بسنے والی ہوں یا شہروں میں رہنے والی۔ یہ سب باتیں انسان کی قوت بہیمیہ کی اندرونی خاصیتوں اور اس کے متعلق ظاہری تدبیروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن سے ارتفاقات معاشی پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انسان کی مَلکی قوت پر غور کیجیے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان اس معاملے میں دوسرے حیوانوں کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ اس کی سمجھ عام حیوانوں کی سمجھ سے بہت اُونچے درجے کی ہے۔ پھر اُس نے بعض علم پیدا کئے ہیں جن میں

سب انسانی افراد برابر کے شریک ہیں سوائے اُن چند بد قسمتوں کے جن میں یہ مادہ ہی نہیں ہے کہ اپنے نوعی خواص قبول کریں۔ جن علموں میں انسانی نوع کا اتفاق ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی پیدائش اور تربیت کا سبب تلاش کرتا ہے۔ کہ میں کیسے پیدا ہوا؟ کیوں پیدا ہوا؟ میری تربیت اور پرورش کس طرح ہو رہی ہے؟ میں کہاں تک ترقی کر سکتا ہوں وغیرہ وغیرہ رفتہ رفتہ سوچتے سوچتے اور غور کرتے کرتے وہ خود بخود یہ علم پیدا کر لیتا ہے۔ کہ اس کائنات کو تدبیر سے چلانے والی کوئی ہستی ضرور ہے جس نے (اس ساری کائنات کو نیستی سے پیدا کیا اور) مجھے بھی وجود دیا۔ اور اب مجھے رزق دے کر پرورش کر رہا ہے اور جس طرح اس کی جنس کے دوسرے حیوانات (یعنی عام حیوانات) ہمیشہ اپنی زبانِ حال سے عاجزی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ انسان بھی اپنی پوری محبت کے ساتھ جان بوجھ کر پورے علم کے ساتھ اپنے پروردگار اور تدبیر کرنے والے (مدبّر) یعنی خدا تعالےٰ کے سامنے پوری پوری عاجزی کا اظہار کرتا ہے (یعنی دوسرے حیوانات کی شکل و صورت اور حالت ہی ایسی ہے کہ وہ سر بسر عاجزی بنے ہوئے ہیں۔ لیکن انسان علم کے ساتھ جانتا ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ کے سامنے عاجزی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اُس نے مجھے نہ صرف پیدا کیا ہے بلکہ

میری زندگی کی ساری تدبیر وہی کرتا ہے۔ اس لیے وہ مُنہ سے بول کر بھی عاجزی ظاہر کرتا ہے) اسی بات کو قرآنِ حکیم ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ[۵۱] . . . . (یعنی کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمام ہستیاں جو زمین اور آسمانوں میں ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے انسان وہ سب اللہ تعالےٰ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔ اور بہت سے انسان ایسے ہیں کہ ان پر عذاب ثابت ہو چکا ہے (یعنی وہ خالق کے آگے جھکنا جانتے ہی نہیں۔ اس کی تشریح یوں سمجھنی چاہیے کہ) ایک درخت کے اندر جو تدبیر کرنے والی "رُوح" کام کر رہی ہے اس کا نام "نفسِ نباتی" رکھ لیں، تو درخت کی تمام ٹہنیاں، پتّے اور شگوفے سب کے سب ہمیشہ کے واسطے اپنی اپنی تدبیر کے لیے (یعنی زمین سے جو غذا ملنی چاہیے اس کے لیے) اس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں۔ اگر درخت کے ایک ایک حصّے کو علیحدہ علیحدہ عقل ہوتی تو ٹہنیاں، پتّے اور شگوفے نفسِ نباتی کا شکریہ ادا کرتے۔ اسی طرح اگر انہیں بولنے کی

---

[۵۱] سورۂ حج : ۱۸

طاقت ہوتی تو وہ نفس نباتی کی طرف اپنی اپنی محتاجی کا احساس کرتے اور اس محتاجی کا احساس ان کے جذبات پر پڑتا۔ اور وہ اس کے آگے دل سے ہاتھ پھیلاتے (اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ چونکہ انسان دانشمند ہے اور تیز سمجھ کا مالک ہے اس لیے وہ اپنی محتاجی کی حالت کو سمجھتا ہے اور عقل سے محسوس کرتا ہے۔ اس کا اس کے دل پر اثر ہوتا ہے جس سے وہ دل و جان سے اپنے خالق کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے)۔

انسان کے ان خواص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی نوع میں سے بعض شخص ایسے ہوتے ہیں کہ حظیرۃ القدس میں انسان کو علم دینے والا جو منبع ہے وہ وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وہاں سے وحی کے ذریعے سے یا صحیح تخمینے کے ذریعے سے یا خواب میں علم ملتا ہے۔ اور دوسرے لوگ اس کامل کے متعلق اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کہ یہ سیدھی راہ پر ہے اور برکت والا ہے۔ اس لیے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جو کام کرنے کا وہ حکم دیتا ہے وہ کرتے ہیں۔ اور جن باتوں سے وہ روک دیتا ہے ان سے بچتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسانی نوع کے ہر ایک فرد میں غیب کے اس خزانے (حظیرۃ القدس) تک پہنچنے کی کچھ نہ کچھ طاقت ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ کبھی تو کسی انسان کو خواب نظر آتا ہے یا کوئی رائے

قائم کرلیتا ہے۔ اور وہ صحیح ثابت ہوتی ہے۔ گویا آنکھوں دیکھی بات ہے یا غیبی آواز سُنتا ہے یا بطور تخمینہ رائے قائم کرلیتا ہے۔ لیکن اس بارے میں سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں بعض کامل ہوتے ہیں بعض ناقص (اور اجتماعیت کا قاعدہ ہے کہ ناقص کامل سے تربیت پانے کا محتاج ہوتا ہے) +

انسان کی خصوصیتیں | غرض انسان میں بعض ایسی صفتیں ہیں جو حیوانات میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے اپنے پیدا کرنے والے اور پرورش کرنے والے کے آگے عاجزی کرنا۔ صاف ستھرا رہنا۔ اجتماع انسانی میں عدالت قائم رکھنا۔ اور لذّتوں میں اس طرح نہ پھنس جانا کہ اپنے فرض کو بھول جائے، اس پر اللہ کے کرشموں اور فرشتوں کی طاقتوں کا ظاہر ہونا۔ مثلاً اس کی دُعا کا قبول ہونا اور تمام کرامتیں اور روحانی ترقی کے مقامات اور حالتیں جو اس پر طاری ہوتی ہیں +

جن باتوں میں انسان باقی حیوانوں سے افضل اور اُونچے درجے کا ہے وہ اگرچہ بہت سی ہیں۔ لیکن ان سب کو دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں :-

(۱) انسان کی عقلی قوّت | (۱) اُس کی عقلی قوّت اَور حیوانوں کی بہ نسبت بہت ہی زیادہ ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں :-

(ا) عقل کا وہ استعمال جو انسان اپنی سوسائٹی کے نظام کو

درست کرنے کے لیے ارتفاقات (زندگی بسر کرنے کے طریقوں) پر غور کرتا ہے۔ اور جس کی مدد سے وہ زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے ارتفاقات میں باریکیاں نکالتا ہے +

(ب) عقل کا وہ حصہ جو بغیر کوشش کے غیبی علوم حاصل کرسکتا ہے +

(۲) انسان کی عملی قوت | (۲) عملی قوّت کا کمال۔ اس کے بھی دو حصے ہو سکتے ہیں :-

(ا) اپنے ارادے، قصد اور اختیار سے کام کرنا کہ وہ انسان کے نفس کا جز بن جائے۔ حیوانات بھی اختیار سے کام کرتے ہیں لیکن اُن کے کاموں کے نتیجے اُن کے نفسوں میں جگہ نہیں پکڑتے اور نہ اُن کے نفس اُن کاموں کی رُوح سے رنگ اختیار کرتے ہیں۔ اُن کے عمل فقط اُن قوّتوں کے لیے ہوتے ہیں جو نسمے سے قائم ہیں۔ اس لیے وہ یہ کام آسانی سے دوبارہ کر لیتے ہیں۔ لیکن انسان کوئی کام کرتا ہے تو کام تو بیشک فنا ہو جاتا ہے لیکن ان کاموں کی "رُوحیں" انسان کے نفس میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گویا انسان کا نفس ان نتیجوں کو "نگل" جاتا ہے (اس "ہضم" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) انسان کے نفس میں روشنی یا اندھیرے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اس شرعی قانون کی اچھی طرح تشریح کر سکتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی

انسان کسی کام کو اپنے ارادے سے نہیں کرتا اُس سے اس کام کے متعلق جواب طلبی نہیں کی جاتی۔ اس جملے کے ویسے ہی معنی ہیں جیسے طبیب کہے۔ کہ زہر یا تریاق اُس وقت تک اثر نہیں کرتا جب تک وہ گلے سے نیچے نہ اُتر جائے۔ اور معدے میں نہ پہنچ جائے (یعنی جس طرح زہر معدے میں پہنچ کر ہضم ہوتا ہے۔ اور پھر خون میں مل جاتا ہے۔ اُس وقت اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی کام ارادے سے کیا جاتا ہے تو وہ انسان کے نفس ناطقہ یا رُوح میں مل کر اس کا جُز بن جاتا ہے اُس وقت اس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے) اور یہ جو ہم نے کہا ہے (کہ انسان کی رُوح عملوں کی رُوح کو ہضم کرتی ہے) تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر قوم اور ملک میں لوگ پوجا پاٹھ کرتے ہیں اور طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ان عبادتوں اور تپسّیاؤں (ریاضتوں) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجدان (NTUITION) سے ان کا نور محسوس کرتے ہیں اور گناہوں اور بُری باتوں سے رُک جاتے ہیں اور گناہوں اور بُری باتوں سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے اُسے وجدان سے محسوس کرتے ہیں۔

(ب) عملی قوّت کے کمال کی دوسری شاخ یہ ہے کہ اس قوّت سے اعلےٰ درجے کے حالات اور روحانی مقامات حاصل ہوتے ہیں جیسے اللہ تعالےٰ کی محبّت اور اُس پر بھروسہ کرنا۔ ان کا نمونہ جانوروں

میں بالکل نہیں ملتا۔ صرف انسانوں میں ملتا ہے) +

انسان کی ضرورتیں | واضح رہے کہ اگرچہ انسان کی صورتِ نوعیہ اس میں معتدل طرز کا مزاج پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن وہ مزاج اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا اور نہ معتدل رہ سکتا ہے۔ جب تک اس کے لئے دو چیزوں کا انتظام نہ ہو):-

(۱) انسانی نوع کو جو علم مل سکتے ہیں وہ اُن کے منبع یعنی حظیرۃ القدس سے لیے جائیں۔ جن کے لیے سب سے پاک انسان کی ضرورت ہے۔ پھر باقی لوگ ان علموں میں اس پاک انسان کی پیروی کریں +

(۲) انسانوں کے لیے ایک قانون (شریعت) ہو جس میں

(ا) اللہ کی پہچان کے طریقے (معارف الٰہیہ) ہوں +

(ب) دنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ (ارتفاقات) ہوں +

(ج) ان کاموں کے لیے جو انسان اپنے اختیار، ارادے اور قصد سے کرتا ہے قاعدے ہوں۔ جن کے مطابق ان کاموں کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہو یعنی (۱) واجب (ضروری، لازم) (۲) مستحب (اچھا لیکن اختیاری) (۳) مباح (۴) مکروہ (۵) حرام +

(د) اللہ تعالیٰ کی نزدیکی (قرب) حاصل کرنے کے مقاموں پر پہنچنے کے لیے ابتدائی باتیں (تمہیدات) صاف طور پر بتائی ہوں۔

عقلی ترقی کا انتظام | چونکہ یہ علوم اور شریعت انسان کی طبعی ضرورت ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ کی حکمت اور رحمت کے مطابق یہ ضروری ہوا۔ کہ وہ اپنے پاک غیب میں (یعنی کائنات کے اس حصّہ میں جو انسان کی مادی نظروں سے اوجھل ہے) انسان کی عقلی قوت کے لئے غذا کا انتظام کرے۔ اور کوئی پاک آدمی وہاں تک پہنچ کر وہاں سے اُسے لے لے اور پھر باقی لوگ اُس کی فرمانبرداری کریں۔ جیسے شہد کی مکھیوں میں ملکہ ہوتی ہے۔ کہ باقی سب قسم کی مکھیاں (نکھٹو ہوں یا سپاہی) سب اس کی پیروی اور فرمانبرداری کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان سب کی زندگی کا انتظام و تدبیر کرتی ہے۔ انسان کو کسی انسان کے ذریعہ سے یا بغیر واسطے کے اُوپر سے علم حاصل نہ ہوتے تو اس کمال کو نہ پہنچ سکتا جو اس کی نوع کا تقاضا ہے ۔

ایک عقلمند انسان جو آنکھیں رکھتا ہے دیکھتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ایسے جانور پیدا کئے ہیں جو گھاس چرنے کے سوا اور کسی طرح اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے تو وہ فوراً اس بات کا بھی یقین کر لیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے لئے ضرور چراگاہ بھی پیدا کی ہے۔ جس میں بہت سی گھاس ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی حکمتوں اور کاریگریوں پر غور کرنے والا انسان جان سکتا ہے کہ ایسے علم بھی موجود ہونے چاہییں جن سے عقل کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں اور

اور اس طرح وہ نوعی تقاضے پوری طرح مکمل کر کے کمال حاصل کرلے

یہ علوم مندرجہ ذیل قسم کے ہونے چاہئیں :-

(۱) اس بات کا علم کہ خدا تعالیٰ ایک ہی ہے اُس کی یکتائی کس طرح ہے؟ اس کی صفتیں کیسی ہیں؟ اور کیا کیا ہیں؟ یہ علم اتنا صاف اور واضح ہونا چاہیئے کہ انسانی عقل خود بخود اسے سمجھ لے۔ اور اتنا مشکل نہ ہو کہ لاکھوں میں سے کوئی ایک آدھ انسان ہی سمجھ سکے چنانچہ اُس نے یہ الفاظ جو فرمائے ہیں کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ (اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے اور ان تمام خوبیوں کا مالک ہے جن کی وجہ سے تعریف کی جا سکتی ہے) تو اُس جملے کی تشریح کرنے سے اللہ کی توحید اور صفتوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنے لئے وہی صفتیں بتائی ہیں جنہیں عام لوگ جانتے ہیں جیسے حیات (زندگی) سمع (سننے کی طاقت) بصر (دیکھنے کی طاقت) قدرت (طاقت و قوت) ارادہ، بولنا، غصہ، ناراضگی، مہربانی، قبضہ، بے پروائی اور سب کے بیان کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ اُس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ "زندہ" ہے لیکن اُس کی زندگی ہماری زندگی جیسی نہیں ہے۔ وہ "دیکھتا" ہے لیکن اُس طرح نہیں جس طرح ہم دیکھتے ہیں۔ وہ قدرت بھی رکھتا ہے لیکن اس کی قدرت اور طاقت ہماری قدرت اور طاقت کی طرح

نہیں ہے۔ وہ ارادہ بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کا ارادہ کرنا ویسا نہیں جیسا ہمارا ہوتا ہے۔ وہ بیشک بولتا بھی ہے لیکن اس کا بولنا ویسا نہیں جیسا ہمارا۔ باقی صفتوں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے اور انہیں اسی طرح سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ ہماری صفتوں کی طرح نہیں ہیں۔ پھر ہم جو کہتے ہیں کہ وہ بے نظیر ہے تو اس کی تشریح ایسی باتوں سے ہونی چاہیئے جو ہماری جنس میں بہت ہی دُور کی سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر خدا تعالٰے کا علم ظاہر کرنا ہو تو یوں کیا جائے کہ وہ تمام دُنیا کی بارش (جو ہو چکی اور جو قیامت تک ہوگی) کے قطروں کی گنتی جانتا ہے۔ اور دُنیا بھر کے ریگستانوں میں ریت کے جتنے ذرّے ہیں اُن کی تعداد بھی جانتا ہے۔ ایسے ہی تمام دُنیا کے درختوں کے پتّوں کی گنتی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ سارے جاندار مل کر کتنے سانس لیتے ہیں۔ اُس کے دیکھنے کی کیفیّت یہ ہے کہ اندھیری رات میں جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے چیونٹی کے چلنے کو دیکھتا ہے اور اس کے علم کی باریکی اتنی ہے کہ جب کوئی انسان اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے لحاف اوڑھ کر دل میں کوئی بات سوچتا ہے تو خدا تعالٰے اُسے بھی جان لیتا ہے۔ یہی حال اُس کی دوسری صفتوں کا ہے۔ وہ بھی اسی [illegible] نے اور اسی طرح بیان

(۲) عبادت کا علم یعنی اس بات کا علم کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کس طرح کریں ۔

(۳) علم ارتفاقات یعنی دُنیا میں زندگی گزارنے کے طریقوں کا علم ۔

(۴) علم مناظرہ یعنی بحث کا علم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ادنےٰ درجے کی طبیعت رکھنے والے انسانوں کے دلوں میں ان علموں کے متعلق جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں شبہے پیدا ہوں تو سچی اور صحیح بات کی حمایت کرنے اور شبہوں سے سمجھ میں جو گرہیں پیدا ہو جائیں انہیں کھولنے کا علم ۔

(۵) انسان کی بصیرت بڑھانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (آلاء اللّٰہ) یاد دلائی جائیں۔ اور قوموں کے اُتار چڑھاؤ کے تاریخی واقعات (ایّام اللہ) یاد دلائے جائیں اور مرنے کے بعد قبر اور حشر میں جو واقعات (وقائع برزخ وحشر) ہونگے وہ بتائے جائیں۔ ان سب باتوں کا علم ۔

علم مختلف درجوں میں | اللہ تعالےٰ نے ازل[۱] میں نوع انسانی پر اور اُس کی اُن استعدادوں (قابلیتوں) پر نظر ڈالی جو تمام انسان کی نسلوں میں

---

[۱] ازل سے وہ زمانہ مراد ہے جس کا شروع نہیں (مرتب)

چلنے والی تھیں اور اُس کی مُلکی قوت پر بھی نظر ڈالی اور یہ دیکھا کہ اُوپر بتائے ہوئے پانچوں قسم کے علموں کی مدد سے تدبیر الٰہی کس طرح انسان کی زندگی کی درستی کرے گی۔ چنانچہ یہ سب علم اللہ تعالےٰ کے غیب الغیب (یعنی تجلّیِ اعظم سے اُوپر کے درجے ہیں) محدود شکل میں آ گئے۔ یہ تمثّل (شکل میں آنا) ہی ہے جسے اشاعرہ اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی (قدیم کلام جس کا تعلق اللہ تعالےٰ کی خاص ذات کے ساتھ ہے) کہتے ہیں اس کا علم، ارادہ اور قدرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ان کے علاوہ چوتھی چیز ہے +

پھر جب ملاءِ اعلیٰ کے پیدا کرنے کا وقت آیا، جن کی نسبت اللہ تعالےٰ کو علم تھا کہ نوع انسانی کا اچھا انتظام ان اُونچے درجے کے نفوس کے بغیر پُورا نہیں ہو سکتا۔ تو اللہ تعالےٰ نے فقط کلمہ "کُن" (ہو جا) کہہ کر اُنہیں پیدا کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نوعِ انسانی پر خاص عنایت تھی کہ ان اُونچے درجے کے فرشتوں کو پیدا کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ساری انسانی سوسائٹی کا اچھا انتظام اُن فرشتوں کے بغیر پُورا نہیں ہو سکتا۔ ان فرشتوں کا پوری نوعِ انسانی کے ساتھ وہی تعلق ہے جو ایک انسان کی عقلی قوتوں کا اُس انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ان بزرگ فرشتوں کے دلوں میں ان علموں کا پرتو ڈالا جو محدود

شکل میں اللہ تعالےٰ کے غیب الغیب میں شکل اختیار کر چکے تھے۔ متمثل ہو چکے تھے) ان فرشتوں نے ان علموں کو ایک قسم کی روحانی شکل پہنا دی۔ اس آیت الذی یحملون العرش ومن حولہ (جو عرش کو تھامے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد گھومتے ہیں)[۱] میں جن فرشتوں کی طرف اشارہ ہے اُن سے یہی فرشتے مراد ہیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

پھر جب آسمانی انتظامات میں ایسی حالتیں پیدا ہوئیں جب بڑی حکومتیں اور ملّتیں ((Supernations)) بدلتی ہیں تو اللہ تعالےٰ نے ان علموں کو اُس زمانے کی ضرورتوں کے مطابق نیا روحانی وجود دیا۔ چنانچہ وہ علوم اُس زمانے کے آسمانی حالات کے مطابق واضح اور صاف شکل میں آ گئے۔ ان آیات انا انزلنٰہ فی لیلۃ مبٰرکۃ انا کنا منذرین۔ فیھا یفرق کل امر حکیم ۰ (ہم نے قرآن کو برکت والی رات میں اُتارا۔ ہم ہی ڈرانے والے تھے، اس رات میں حکمت کی بات بٹتی ہے)[۲] پھر اللہ تعالےٰ کی حکمت نے اس زمانے کا انتظار کیا جب انسانی اجتماع (سوسائٹی) میں ایک ایسا آدمی پیدا ہو جو نہایت پاک ہو اور جو اس خزانے سے

---

[۱] سورۃ مومن: ۷ [۲] سورہ دُخان: ۳-۴

علم لینے کی استعداد (قابلیت) رکھتا ہو۔ اللہ کی حکمت یہ فیصلہ بھی کر چکی تھی کہ اس شخص کی شان بہت اونچی ہو اور اس کا درجہ نہایت بلند ہو۔ چنانچہ جب وہ شخص وجود میں آجاتا ہے (پیدا ہو جاتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے لئے خاص کر لیتا ہے اور اسے اپنے ارادے کے پورا کرنے کا آلہ بنا لیتا ہے۔ اس پر کتاب (نوع انسانی کے لئے مجموعہ قوانین) اُتارتا ہے۔ اور اس کی پیروی اپنے بندوں پر ضروری قرار دے دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ کے بارے میں جو آیا ہے کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (میں نے تجھے اپنے لئے خاص کر لیا)[1] اس کا یہی مطلب ہے۔

ان علموں کے جتنے درجے اُوپر نیچے مقرر ہوتے گئے ان کی اصل حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی کو کامل بنانا چاہتا ہے چنانچہ غیب الغیب (تجلّی اعظم سے اُوپر کے درجے) میں یہ علوم ایک خاص شکل میں مقرر ہو گئے۔ اس کا سبب بھی فقط یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اپنی خاص مہربانی کرنا چاہتا تھا۔ پھر انسانی نوع کی مجموعی استعداد (قابلیت) نے ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کی پیدائش کو ضروری قرار دے کر درخواست کی کہ وہ بھی پیدا کئے جائیں۔ ایسے

---

[1] طٰہٰ : ۴۱

ہی خاص زمانے میں نوعِ انسانی کے مخصوص حالات کے مطابق ایک خاص شکل میں قانون کی طلب بھی خود نوعِ انسانی نے کی (یعنی انسان کی نوع کی ساخت کا تقاضا تھا۔ کہ اس کی فطرت کے مطابق اُسے فلاں فلاں قانون دیئے جائیں۔ اور پھر جب انسانی نوع میں ایک خاص قسم کے حالات پیدا ہو جائیں مثلاً بادشاہت کے ظلم انتہا کو پہنچ جائیں، اور ساری کی ساری سوسائٹی ایک ایسے چھوٹے سے طبقے کے قبضے میں آجائے جو اُسے اپنی عیش پرستیوں کے لئے استعمال کرے اور اس طرح انسانیت خدا کو بھول جائے تو ایک خاص قسم کا قانون دیا جائے، جو اس حالت کے مناسب ہو۔ یہ سب باتیں خود انسانی نوع کے تقاضے تھے۔ جو خدا نے پورے کئے۔ گویا یہ قوانین نوعِ انسانی نے طلب کئے جو خدا تعالےٰ نے اپنی مہربانی سے دیئے۔ خدا تعالےٰ نے یہ قوانین اپنی طرف سے بے ضرورت اور جبراً نہیں دیئے) اس طرح اللہ کی حجت انسانی نوع پر پوری ہو گئی (یعنی اب اگر نوعِ انسانی یا اُس کا کوئی حصہ یا کوئی فرد ان قانونوں کے خلاف کرے تو اُسے سزا دینے میں خدا تعالےٰ پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ وُہ کہہ سکتا ہے کہ تم نے یہ قانون طلب کیا مَیں نے دیا۔ اب اس پر عمل نہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اِس کا جواب کوئی انسان نہیں دے سکتا)

اب اگر کوئی پوچھے کہ انسان کے لئے | یہ علم انسان کے لئے طبعی ہیں

نماز پڑھنا کیوں ضروری ہے؟ وہ کیوں رسولؐ کی فرمانبرداری کرے؟ زنا اور چوری اس کے لئے کیوں ناجائز کی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض چیزوں کا انسان کے لئے کرنا اور بعض سے بچنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح گائے بیل وغیرہ کے لئے فقط گھاس کا کھانا جائز ہے۔ گوشت ان کے لئے "حرام" ہے۔ اور شیر وغیرہ جانوروں کے لئے گوشت کھانا واجب (ضروری) ہے۔ اور گھاس کھانی منع (حرام) ہے۔ ایسے ہی نکھٹو وغیرہ مکھیوں کو اپنی ملکہ کی فرمانبرداری کرنا ضروری ہے۔ اس بارے میں انسانوں اور حیوانوں میں صرف یہ فرق ہے کہ حیوانوں کو یہ باتیں جبلّی الہام کے ذریعے بتائی گئی ہیں (یعنی ان کی فطرت ہی میں یہ باتیں ڈال دی گئی ہیں اور وہ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر سیکھے سکھائے خود بخود کرتے ہیں) لیکن انسان اپنے علوم تجربے اور دیکھ بھال اور سوچ بچار سے حاصل کرتا ہے یا وحی سے حاصل کرتا ہے یا کسی بڑے حکیم یا نبی کی پیروی (تقلید) کرکے حاصل کرتا ہے۔

آٹھواں باب (۸)

شرعی قانون جزا اور سزا کے لئے کیوں لازم ہے

اس میں شک نہیں کہ ساری کائنات

(Universum Permagnum) مجموعی طور پر ایک وحدانی

تدبیر کے نیچے کام کر رہی ہے۔ یعنی ساری کائنات میں قانون

کا ایک ہی مجموعہ چل رہا ہے۔ اور اس کائنات کا کوئی حصّہ،

کوئی جزو، کوئی ذرّہ قوانین کے

ایک قانون باہمی کشش کا ہے۔ جو کائنات کا سب

سورج ہماری زمین کے ایک ایک ذرّے کو اپنی

ہے۔ اور ہماری زمین کا ایک ایک ذرّہ اس کائنات کے ایک ایک ذرّے کو کھینچ رہا ہے۔ ایسے ہی مادے کی ساخت ساری کائنات میں یکساں ہے۔ یعنی وہی برقیات ہیں۔ جو ہماری زمین کے خاک کے ذرّے کے آخری جز ہیں اور وہی برقیات ہیں جو اکاش گنگا یا کہکشاں کے سب سے دور کے ستارے میں پائے جاتے ہیں[1]۔ جو ہم سے نو ہزار تین سو نوری سال کے فاصلے پر ہے[2]۔ یہی حال سب سے

---

[1] اس کا ثبوت یہ ہے کہ کہکشاں کے اس حصّے کی روشنی بالکل ہمارے سورج کی روشنی کے مانند ہے۔ چنانچہ جس آلے سے روشنی کو پھاڑ کر دیکھتے ہیں (اسے طیف نما کہتے ہیں) اس سے ساری کائنات کی روشنی ایک ہی قسم کی ثابت ہوتی ہے۔ (مرتب)۔

[2] روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار ۲۸۵ میل فی ثانیہ (سیکنڈ) شمار کی گئی ہے۔ اس حساب سے روشنی کی کرن ایک سال میں کم سے کم ۵۸ کھرب ۷۵ ارب میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ یہ فاصلہ ستاروں وغیرہ کے لمبے لمبے فاصلے ناپنے کے لئے اکائی کا کام دیتا ہے۔ اسے ایک نوری سال کہتے ہیں۔ (مرتب)

دُور کے سحابیے[1] کا ہے۔

جس طرح ساری کائنات قانون کے ایک مجموعے میں بندھی ہوئی ہے۔ اسی طرح اس کا ایک ایک حصّہ ضمنی قوانین کا پابند ہے۔ مثلاً نباتات کی نشوونما کا ایک قانون ہے۔ حیوانات کے سوچنے کا ایک قانون ہے۔ گیسوں (Gasses) کا ایک قانون ہے۔ اسی طرح نوع انسان ایک ایسے قانون کے مجموعے کا تقاضا کرتی ہے جس کے مطابق کام کر کے وہ نہ صرف اس مادی دُنیا میں اچھی زندگی گزار سکے بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی اسی قانون کا تسلسل کام دیتا رہے۔ جیسے ہم چاہتے ہیں کہ ایک بچّے کی پرورش بچپن میں ایسی ہو کہ نہ صرف اس کی بچپن کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں بلکہ اس تربیت کے نتیجے جوانی میں بھی اس کے کام آئیں۔ اسی طرح جوانی میں اس کی تربیت ایسی ہونی

---

[1] کائنات کی فضا میں جگہ جگہ مادے کے بادل سے نظر آتے ہیں جو روشن ہیں انہیں سحابیے (Nebulae) کہتے ہیں۔ اس قسم کا سب سے دُور کا سحابہ ہم سے ۴۲ کروڑ نواسی سال کے فاصلے پر واقع ہے (مرتّب)

چاہیے کہ نہ صرف جوانی میں اس کے لئے فائدہ مند ہو بلکہ بعد کی ساری زندگی میں اس تربیت کے نتیجے اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں ایسے ہی انسان کی دنیاوی زندگی اس طرح بسر ہونی چاہیے کہ وہ نہ صرف اس دُنیا میں مفید ثابت ہو۔ بلکہ اس زندگی کے عملوں (کرموں) کے نتیجے مرنے کے بعد کی زندگی میں جو وہ اس مادی واسطے (Medium) میں بسر نہیں کریگا۔ بلکہ ایک اور ہی واسطے (Medium) میں گزارے گا۔ فائدہ دیں - اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کسان اناج بوتا ہے۔ اُسے پانی دیتا ہے، کھاد ڈالتا ہے اور اُس کی نگرانی کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو اناج پیدا ہوتا ہے وہ نہ صرف اُس کی موجودہ ضرورتیں اچھی طرح پوری کر دیتا ہے بلکہ اگلی فصل کے لئے بہت عمدہ بیج کا کام دیتا ہے۔ اگر وہ فصل کی اس طرح پرورش نہ کرے تو اس کے پیدا کئے ہوئے اناج کے دانے چھوٹے چھوٹے، مرجھاتے ہوئے اور بے جان سے ہونگے۔ اگر یہی دانے اگلی فصل کے بیج کے طور پر بوئے جائیں تو اگلی فصل نکمی ہو گی۔ اس کے برخلاف اگر اب کی فصل کی اچھی طرح پرورش کرے تو اُس کی اب کی فصل

کا اناج بھی موٹا، اچھی غذا والا اور عمدہ ہوگا۔ بلکہ وہ اگلی فصل بھی اچھی دیگا ۔

بالکل یہی حال انسان کی زندگی کا ہے۔ اُس کی اِس دُنیا کی زندگی اور مرنے کے بعد کی زندگی دو مختلف زندگیاں نہیں ہیں بلکہ دونوں زندگیاں لگاتار اور مسلسل ہیں یعنی مرنے کے بعد کی زندگی ہماری اس زندگی ہی کا نتیجہ ہے۔ اِس زندگی میں ہم جو جو کام کرتے ہیں اُن کا نتیجہ، جوہر اور خلاصہ ہمارے نسمے (Nasmic Body) کے اندر محفوظ رہتا ہے۔ یہی جوہر یا خلاصہ اس زندگی میں بھی اپنے کچھ نتائج دکھاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد کی زندگی میں زیادہ نمایاں طور پر نتیجے پیدا کرے گا۔ پھر یہ نتیجے آگے چل کر اور نتیجوں کے پیدا کرنے کے سبب بنیں گے ۔

غرض انسان کی جتنی بھی زندگی ہوگی اس میں عام باتیں اِن نتیجوں کے مطابق ہوں گی اِس زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں اچھے نتیجے پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی نوع کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اُن کے خلاف کام نہ کرے۔ اُسے یقین رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے کاموں کے نتیجوں سے کبھی نہیں

بچا سکنا +

اس باب میں اس حقیقت کو نہایت صاف طور پر پیش کیا گیا ہے +

انسان کے کاموں کے نتیجوں کے اسباب | واضح رہے۔ کہ انسان اپنے عملوں کے مطابق نتیجے پائیں گے۔ اگر کام اچھے ہیں تو نتیجے بھی اچھے ہوں گے۔ اگر کام بُرے ہیں تو نتیجے بھی بُرے ہوں گے +

انسان کے کاموں سے اچھے بُرے نتیجے پیدا ہونے کے چار اسباب ہیں :-

(۱) صورت نوعیہ کا تقاضا | (۱) انسان کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا :-

حیوان کا مزاج چاہتا ہے کہ وہ گھاس چرے اور درندے کا مزاج تقاضا کرتا ہے کہ وہ گوشت کھائے۔ اگر حیوان گھاس چریگا اور درندہ گوشت کھائیگا تو اس کا مزاج درست رہتے گا اور اگر حیوان گوشت کھائے گا یا درندہ گھاس چرے گا تو اس کا مزاج بگڑ جائے گا اسی طرح اگر انسان اپنے ارادے اور قصد سے ایسے کام کرے جن کی تہ میں یہ چار خوبیاں ہوں تو اس کا ملکی مزاج درست رہے گا اور اس کی عقلی صحت قائم رہے گی :-

(۱) اپنے پیدا کرنے والے کے آگے جُھکنا اور عاجزی کرنا (خشوع یا اخبات) +

(۲) پاکیزگی یعنی بدن، لباس اور خیالات کو ہر قسم کی گندگی سے

پاک رکھنا (نظافت)۔

(۳) لذتوں میں نہ پھنسنا (سماحت)۔

(۴) انصاف اپنی زندگی کے تمام معاملات میں (عدالت)۔

جب انسان ایسے کام کرتا ہے جن کی رُوح ان خصلتوں کے خلاف ہو۔ تو انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور اُس کی ملکی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اگر وہ آج تکلیف محسوس نہیں کرتا جو ملکی مزاج کے بگڑ جانے سے اُسے محسوس ہونی چاہیئے تو جس وقت بدن کے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا ملکی مزاج کے خراب ہو جانے سے پُوری پُوری تکلیف محسوس کرے گا یا اس کی صحت کی حالت میں اُسے پورا پورا آرام محسوس کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ انسان کے بدن کو کسی سُن کرنے والی چیز (مخدّر) سے سُن کر دیا جائے تو وہ جگہ آگ کی جلن محسوس نہیں کرتی لیکن جب اس دوا کا اثر دُور ہو جاتا ہے تو درد محسوس ہونے لگتا ہے۔

(۲) ملاءِ اعلیٰ کا اثر | (۲) ملاءِ اعلیٰ کا اثر :۔

انسان کے دماغ میں اُس کی سب ذہنی قوتیں موجود ہیں۔ جب بدن کے کسی حصّے پر کوئی بیرونی اثر ہوتا ہے وہ جھٹ اس کی اطلاع دماغ کو دیتا ہے۔ چنانچہ اگر اتفاقاً پاؤں چنگاری پر پڑ جائے یا پاؤں تلے برف کا ٹکڑا آ جائے تو جھٹ دماغ کو محسوس ہو جاتا ہے کہ پاؤں کے نیچے چنگاری آگئی ہے یا برف کا ٹکڑا آگیا ہے۔ اسی طرح حظیرۃ القدس

میں نوع انسانی کی جو نوعی صورت یا امام نوع انسانی یا انسانِ اکبر موجود ہے، اللہ تعالےٰ نے اپنی مہربانی سے اُس کے لئے خادم فرشتے پیدا کر دیے ہیں۔ جو اُس انسانِ اکبر کے لیے حواس کی مانند ہیں۔ جس طرح ہم اپنی احساس کرنے والی قوتوں کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح وہ امام نوع انسانی اُن فرشتوں کی مدد کے بغیر اپنا کام پورا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب کوئی انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اُس کا پہلا اثر فوراً امام نوع انسانی کے دماغ تک پہنچتا ہے۔ اور اُن فرشتوں سے خوشی اور سرور کی کرنیں نکلتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اُس کے نوعی تقاضے کے خلاف ہے تو اُس کی خبر بھی فوراً امام نوع انسانی کو ہوتی ہے۔ اور اُن فرشتوں سے نفرت اور دشمنی کی کرنیں نکلنے لگتی ہیں۔ اُن فرشتوں کی کرنیں اُس انسان کی طرف آتی ہیں۔ اور اُس کے دماغ پر اثر کرتی ہیں اور وہ بھی اُن کا اثر قبول کرتا ہے یعنی اچھے کام سے خوشی اور اطمینان اور بُرے کام سے افسوس اور نفرت۔

ساتھ ہی ان فرشتوں کی طرف سے آئی ہوئی کرنوں کا اثر ملاء سافل (Lower Angelic Region) کے فرشتوں پر اور حساس انسانوں پر بھی پڑتا ہے۔ اگر کام اچھا ہے تو ان فرشتوں اور ان انسانوں کے دلوں میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ اُس انسان سے محبت کریں اور اس سے اچھا سلوک کریں۔ اگر کام بُرا ہے تو اُن کے دلوں

میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ اُس سے نفرت کریں اور اُس سے بُرا سلوک کریں۔ اُس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے ہمارا پاؤں چنگاری پہ پڑتا ہے تو دماغ کی ادراکی قوتیں (محسوس کرنے اور سوچنے والی قوتیں) جلنے کا درد محسوس کرتی ہیں اس کے بعد دماغ سے ایک شعاع نکلتی ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ اُس کے اثر سے دل میں غم پیدا ہو جاتا ہے اور طبیعت (جگر) پہ اثر کرتی ہے تو اُس سے بخار ہو جاتا ہے۔

ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کی تاثیر ہمارے بدنوں میں بالکل ویسی ہی ہے جیسے ہماری ادراکی قوتیں ہمارے بدنوں پہ اثر ڈالتی ہیں چنانچہ جب ہم میں سے کسی انسان کو آنے والا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ جس میں نہایت شدید درد کا ڈر ہو یا نہایت خوفناک بے عزتی کا ڈر ہو تو وہ کانپنے لگتا ہے۔ اُس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ خواہش نفسانی مر جاتی ہے۔ پیشاب سُرخ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو پیشاب خطا ہو جاتا ہے یا پاخانہ نکل جاتا ہے۔ یہ سب باتیں طبیعت پہ انسان کی ادراکی قوتوں کے اثر سے ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ حادثہ پیش نہیں آیا ہوتا۔ بلکہ اُس کے پیش آنے کا ڈر ہوتا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری ادراکی قوتیں بدن کی مختلف طاقتوں کو (مثلاً پٹھوں کی طاقتوں کو اعصابا تی طاقتوں کو دیکھنے، سُننے، دیکھنے، چکھنے وغیرہ کی طاقتوں کو) خفیہ پیغام بھیجتی ہیں اور

ان پر پورا پورا غلبہ رکھتی ہیں۔ بالکل اسی طرح نوع انسانی کی تدبیر کرنے والے فرشتے جو ملاءِ اعلیٰ (Upper Angelic Region) میں ہیں، انسانوں اور ملاء سافل کے فرشتوں پر جبلّی الہام[۵۱] اور طبعی حالات[۵۲] نازل کرتے رہتے ہیں ٭

غرض تمام انسان جو زمین پر بستے ہیں وہ اُن فرشتوں کے اُسی طرح ماتحت ہیں جس طرح بدن کی سب قوتیں ہماری ادراکی قوتوں کے ماتحت ہیں ٭

جس طرح انسانوں کے کاموں کی تاثیر سے فرشتوں کی طرف سے شعاعیں نیچے کو آتی ہیں اُسی طرح اُن فرشتوں سے ایک قسم کا نورانی رنگ حظیرۃ القدس میں بھی چڑھتا ہے۔ وہ رنگ وہاں ایک نئی استعداد پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے آگ کے پاس پانی رکھا جائے تو اُس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے یا جیسے ذہن میں دو ملتی جلتی باتوں پر

---

۵۱ وہ خفیہ پیام جو انسان کی طبیعت پر براہِ راست اثر کرتا ہے۔ اس کا انسان کی عقل کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا (مرتّب)

۵۲ وہ کیفیتیں جن سے انسان کا مزاج اور طبیعت متاثر ہوتی ہے۔ یہ "باتیں" نہیں ہوتیں بلکہ حالتیں ہوتی ہیں۔ جیسے خوشی کی کیفیت۔ غم کی حالت وغیرہ (مرتّب)

غور کیا جائے تو ذہن ایک خاص نتیجہ پیدا کر لیتا ہے یا دعا متضرعی کا نتیجہ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ملاء اعلیٰ کی طرف سے حظیرۃ القدس کی طرف چڑھنے والا یہ رنگ تجلّی الٰہی سے ایسی صورت پیدا کرنے کا سبب بہم پہنچاتا ہے جسے نیک کاموں کی صورت میں اللہ کی رحمت اور خوشنودی (رضا) کہا جاتا ہے۔ اور بُرے عملوں کی شکل میں اللہ کا غضب اور اس کی لعنت کہا جاتا ہے۔ اُس وقت اللہ کی صفتوں میں ایک نیا رنگ (تجدّد) پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً پہلے غضب تھا تو اب رحمت بن گئی۔ یا پہلے رحمت تھی تو اب غُصّہ بن گیا (مثلاً ایک شخص نے بُرا کام کیا تو اللہ تعالےٰ کی صفتوں میں ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا۔ جسے غضب کہا جا سکتا ہے۔ پھر اُس نے اچھا کام کیا تو وہی رنگ ایک اَور رنگ سے تبدیل ہو گیا۔ اسے رحمت کہا جا سکتا ہے) جیسے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی نفسی کیفیت میں تبدیلی نہ کر لے[1]) اور حضرت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی فرماتے ہیں کہ فرشتے آدمیوں کے کام آسمان پہ لے جاتے ہیں اور اللہ تعالےٰ اُن سے پوچھتا ہے کہ میرے بندوں کو

---

[1] سورۃ رعد: ۱۱

کیسے چھوڑا؟ نیز فرماتے ہیں کہ دن کے کام رات کے کاموں سے پہلے آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان باتوں سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فرشتے آدمیوں اور اللہ تعالےٰ کے نور کے درمیان جو حظیرۃ القدس میں قائم ہے واسطہ ہیں۔

(۳) شرعی قانون کا تقاضا | (۳) شرعی قانون کا تقاضا :

(قانون دُنیا میں نازل ہونے سے پہلے حظیرۃ القدس میں مدوّن ہوتا ہے۔

پہلی مصلحتیں جو اُوپر بیان ہو چکی ہیں انسانیت کے عام تقاضے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس مد میں اُن مصلحتوں کی اُس شکل کا ذکر ہے جو قانون کے اندر آجاتی ہیں۔ یعنی قانون کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ انصاف کرنے والی طاقت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ طاقت ہمیشہ قانون کی شکل کی پابندی کرتی ہے۔ اور اُسی کو سمجھ سکتی ہے۔ اعلیٰ طاقت قانون کی رُوح کا زیادہ لحاظ رکھتی ہے۔ قانون کے باہر انسانی سوسائٹی کے لئے جو مصلحتیں ضروری ہوں اُن پر نہ اعلیٰ طاقت بحث کرسکتی ہے۔ نہ ادنےٰ طاقت۔ اس پر فقط قانون بنانے والی طاقت بحث کرسکتی ہے۔

دُوسرے اور تیسرے سببوں میں وہی فرق ہے جو

قانونی کونسل کے ممبروں کے نظریات اور عدالتی جماعت کے نظریات میں ہوتا ہے۔ قانون ساز جماعت قانون کی روح محفوظ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور عدالتی جماعت اس قانون کے لفظوں کی پیروی کرتی ہے۔ اسی طرح دوسرے سبب میں انسانیت کے عام تقاضوں کا ذکر تھا اور تیسرے میں اُن قانونوں کا ذکر ہے جو اس روح کو محفوظ کرنے کے لئے بنے ہیں) +

(انسان کے لئے شریعت کس طرح مقرر ہوتی ہے؟ اس کی تشریح کے لئے پرانے علم نجوم کی مثال زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے کہ سیّدنا ابراہیمؑ سے پہلے کی شریعتیں عموماً نجوم ہی کے قواعد پر مرتب ہوئی تھیں) +

جب ستاروں کے مجموعے میں کوئی ستارہ ایک خاص طرح پر دوسرے ستاروں کے سامنے آتا ہے منجّم جان لیتا ہے کہ اس وقت وہاں ایک ایسی روحانی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ان ستاروں کی قوّتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ پھر چاند کے ذریعے سے جو آسمانی احکام کو زمین کی طرف پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ وہ روحانیت زمین پر پہنچ جاتی ہے تو لوگوں کے خیالات اس روحانیت کی تاثیر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی مثالوں کو پہچاننے والا جانتا

ہے کہ رُوحانی اجتماع کا وہ وقت قریب آگیا ہے جیسے شریعت میں لیلۃٌ مُبارکۃٌ (برکت والی رات) کہا گیا ہے۔ جس میں تمام حکمت کی باتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ اُس وقت فرشتوں میں ایک خاص قسم کی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں نوعِ انسانی کے احکام اور اُس زمانے کا تقاضا بھی شامل ہوتا ہے۔ وہاں سے اُس زمانے کے سب سے مقدّس انسان پر الہام ہونے شروع ہوتے ہیں۔ اور اُس انسان کے ذریعے (واسطے) سے اُن لوگوں کے دلوں میں بھی الہام آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو اُس مقدس انسان کے قریب قریب ذہن رکھتے ہیں۔ اُس کے بعد . . . . .

اُس جماعت کے ذریعے سے عام انسانوں کو ان الہاموں کو قبول کرنے اور انہیں اچھا سمجھنے کا الہام ہوتا ہے۔ اور جو آدمی اُن الہاموں کی تائید کرے اُسے قدرتی مدد ملتی ہے۔ جو آدمی اُن کے خلاف کرے وہ قدرتی اسباب سے شکست پاتا ہے اِسی طرح نچلے طبقے کے فرشتوں کو الہام ہوتا ہے۔ کہ اِن الہاموں کے ماننے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور نہ ماننے والوں سے بُرا سلوک کریں۔ پھر اُس جماعت سے جو الہام قبول کر چکی ہوتی ہے ایک نورانی رنگ ملاء اعلیٰ اور حظیرۃ القدس میں پہنچتا ہے۔ تو وہاں اللہ کی صفات میں نئے طور پر خوشنودی یا ناراضگی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں ؛

(۴) نبی کی اطاعت | (۴) نبی کی اطاعت :

جب کوئی نبی الہام پاکر لوگوں میں اپنی تحریک پھیلانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کا یہ ارادہ ہوتا ہے کہ اُس کے کھڑے ہونے سے اُن لوگوں پر رحم کرے اور اُنہیں اچھے یعنی ترقی کے درجے کے قریب پہنچا دیا جائے۔ تو اس نبی کی اطاعت لوگوں پر لازم قرار دے دی جاتی ہے اور وہ علم جو نبی کے پاس الہام کے طور پر آیا تھا نبی کی دُعا اور اُس کی ہمت کے ساتھ مل کر ایک مخصوص شکل پیدا کر لیتا ہے۔ اب اللہ تعالےٰ کی مدد اُس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد وہ علم نہایت پکا اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

(نبی اپنی قوم میں سے اپنے اردگرد سے اچھے لوگ چُن لیتا ہے تو اُن کی فطرت اور طبیعت کے مطابق اس اصولی قانون پر مبنی ضمنی قوانین (Bye-Laws) تجویز کرتا ہے۔ اس حالت میں یہ قانون (ضمنی) عمومیت پر اُس قدر نہیں رہتا جس قدر تیسرے درجے میں تھا بلکہ اس خاص جماعت کی ذہنیت کے لئے ایک خاص شکل میں معین ہو جاتا ہے۔ اوپر تیسری شق میں قانون کی جس شکل کا ذکر آیا ہے اُس کے لئے کسی خاص زبان کی

صورت نہیں ہوتی۔ لیکن چوتھے درجے میں یعنی جب
وہ قانون نبی کے ذریعے سے اس کی جماعت
کو پہنچایا جاتا ہے۔ اس نبی کی زبان قانونی درجہ حاصل کر لیتی
ہے۔

ان درجوں کا باہمی مقام | پہلے اور دوسرے اسباب کی بنا پر (یعنی صورتِ نوعیہ کے تقاضے کے مطابق اور ملاءِ اعلیٰ کے تقاضے کے مطابق) انسان کو جو جزا دی جاتی ہے وہ انسانی فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شروع سے لے کر قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس جزا کی بنیاد نیکی اور بدی کے عام اصول اور قاعدوں پر ہوتی ہے۔ خاص شاخوں اور خاص حدوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ یہی فطرت وہ دِین ہے جو ہر زمانے میں ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ اور زمانوں کے بدلنے کے ساتھ نہیں بدلتا۔ تمام انبیاء کا اس پر اتفاق ہے۔ جیسے قرآنِ حکیم میں آیا ہے۔ کہ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (تم سب کی ایک ہی امت ہے)[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ الانبیاءُ بنو علاتٍ ابوھم واحد وامھاتھم شتّٰی (تمام نبی آپس میں اس طرح

---

[1] مومنون: ۵۲

ہیں کہ ان سب کا باپ ایک ہے۔ مگر مائیں الگ الگ ہیں) کسی قوم میں کوئی نبی آتے یا نہ آئے کم سے کم اِن دو اصول پر اس قوم سے ضرور جواب طلبی ہوگی۔ اس لئے کہ انسانی عقل اتنے حصّے کی ذمہ داری کو اپنی فطرت سے خود سمجھ سکتی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے انسانی عقل کا عمومی درجہ کافی ہے۔

تیسرے سبب سے یعنی شریعت کی بنا پر انسانوں کو جزا مل سکتی ہے۔ وہ ہر زمانے کی اپنی شریعت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے سمجھانے کے لئے نبی اور رسول آتے ہیں۔ کیونکہ خاص خاص حالتوں کے مطابق جس جس قانون کی ضرورت ہے وہ اُستاد کی تعلیم کے بغیر انسان سمجھ نہیں سکتا۔ یہ اُستاد انبیاء اور رسول ہوتے ہیں۔ انہی کی برکت اور کوشش سے اُن کی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ انما مثلی ومثل ما بعثنی اللہ بہ کمثل رجلٍ اتی قوماً فقال یقوم: انی رایت الجیش بعینی وانّی انا النذیر العریان فالنجاء فالنجاء فاطاعہ طائفۃ من قومہ فادلجوا فانطلقوا علی مھلھم فنجوا وکذبت طائفۃ منھم فاصبحوا مکانھم فصبحھم الجیش فاھلکھم واجتاحھم فذلک مثل من اطاعنی فاتبع ما جئت بہ ومثل من عصانی وکذب بما جئت بہ من الحق (یعنی میری اور مجھے

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دے کر بھیجا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کسی قوم کے پاس آیا اُس نے کہا میرے بھائیو! میں اپنی آنکھوں سے تمہیں تباہ کرنے والا لشکر دیکھ آیا ہوں۔ میں تمہیں صاف صاف ڈراتا ہوں۔ خبردار ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو بچاؤ۔ چنانچہ قوم کے ایک حصّے نے اُس کی مان لی اور رات کی تاریکی میں وہاں سے چل پڑا اور بچ گیا۔ لیکن دُوسرے حصّے نے اس بات کو جھٹلایا اور صبح تک وہیں سوتا رہا۔ صبح سویرے لشکر اس کے سر پر آپہنچا۔ اور اُسے ہلاک کر دیا۔ یہی حال اس شخص کا ہوگا۔ جو میری پیروی کریگا۔ اور جو میں لایا ہوں اس کی پیروی گا۔ اور جو مجھے جھٹلائے گا اور جو سچی بات میں لایا ہوں اسے جھٹلائے گا")

چوتھے سبب یعنی نبی کی بعثت کی وجہ سے جو جزا ملتی ہے، وہ اُس وقت ملتی ہے۔ جب نبی آجائے۔ وہ اپنی دعوت پھیلا دے اور لوگوں کے دلوں میں جو شبہے پیدا ہوں وہ دُور کر دے۔ اور اپنی بات ان کے دلوں میں اچھی طرح بٹھا دے[۵] (اس

---

[۵] فلا تکلیف الّا بعد ازالۃ الخفاء وثبوت البعثۃ والدعوۃ (التفہیمات الالٰھیۃ، الجزء الاوّل ص۲۳) (انسان کسی نبی کو اس وقت تک ماننے کے ذمہ دار نہیں ہوتے جب تک اس کی ذات اور اُس کی تعلیم کے متعلق تمام ابہام دُور نہ ہو جائیں اور اس کی بعثت اور دعوت کا ثبوت بہم نہ پہنچ جائے) (مرتب)

کے بعد اُس قوم پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ جب تک قوم کا ایک بڑا حصّہ اُسے سمجھ نہ لے۔ اور تھوڑا حصہ سمجھانے کی تمام دیانتدارانہ کوششوں کے باوجود نہ سمجھے اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ لیکن عذاب کا تعلق فقط تعلیم کے چوتھے درجے کے ساتھ ہے۔ البتہ عام انسانی عقل، انسانیت کی جن مصلحتوں کو اپنی دیانتدارانہ کوشش سے پہچان سکتی ہے۔ اسی طرح قانون کے عام درجے کی بات جسے عام انسانی جماعت اپنی عام عقل کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اُسے بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اُس کا عذر مانا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح اگر چوتھے درجے میں قانون کا عام اعلان ہو جائے اور کوئی شخص ایسا ہو جسے اس کا علم نہ ہو، تو اس قانون کو اس جماعت میں جاری کرنے سے روکا نہیں جا سکتا اور نہ اس شخص کو اس قانون کے ماننے سے بری کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ اُس کا فرض ہو گا کہ قانون کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

بحث کا خلاصہ پہلے تین درجے انسانی فطرت کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے وہاں اشاعت اور تشریح ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ایک انسان کا تمدن اور سوسائٹی میں پیدا ہو جانا اور وہاں زندگی بسر کرنا کافی سمجھا جاتا ہے کہ قانون کے اس عمومی پہلو کو اپنی عمومی عقل سے سمجھ جائے گا۔ اس کے لئے نبی

کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نبی تو وہ باتیں سمجھانے کے لئے آتا ہے جن کے سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس سے زیادہ بوجھ قانونی معلم کے ذمے ڈال دیا جائیگا۔ تو قانونی سوسائٹی پیدا نہیں ہو سکے گی اسی درجے کے لئے قرآن حکیم میں آیا ہے کہ لیھلک من ھلک عن بینۃ و یحیٰ من حی عن بینۃ (یعنی جو ہلاک ہو وہ سوچ سمجھ کر ہلاک ہو اور زندہ رہے وہ بھی سوچ سمجھ کر زندگی بسر کرے) [یعنی جزا سزا کا چوتھا درجہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ نبی آ جائے، لوگوں کے شبہات دُور ہو جائیں اور نبی کا پیغام اچھی طرح لوگوں تک پہنچ جائے۔ ان تینوں باتوں کے پُورا ہوئے بغیر اس چوتھے درجے سے پیدا ہونے والی جزا لوگوں پر نہیں آتی +]

نواں باب
(۹)

انسانی سوسائٹی میں جبلّی اختلافات

نواں باب (۹)

انسانی سوسائٹی میں جبلّی اختلافات

انسانی خصلتوں اور ان خصلتوں کے مطابق انسان جو کام کرتا ہے اُنہیں دو قسموں میں تقسیم کرنا چاہیے۔

(۱) انسان کی خصلتوں کا ایک حصّہ ایسا ہے کہ وہ لوگوں سے سیکھ کر خیال بناتا ہے اسی کے مطابق اُس کے اندر عادتیں اور خُلق پکّے ہو جاتے ہیں۔ وہی خُلق اُسے کمال پر پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔

(۲) انسان کی خصلتوں اور کاموں کا دوسرا حصّہ وہ ہے

کہ اگر اس انسان کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ معمولی انسانی سوسائٹی میں رہے اور اس کے لئے ایک خاص مقصد سامنے رکھ کر تعلیم دینے کا موقعہ ہی پیدا نہ ہو تو بھی وہ اپنی طبیعت میں جس قدر جذبات پائے گا اُن کے مطابق اپنی زندگی کا ایک پروگرام بنائے گا۔ یہ حصّہ زیادہ تر تبدیل نہیں ہوتا۔ اس میں تعلیمی رنگ ایک حدتک اثر کرتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو بدل چکا ہے۔ لیکن جونہی اس تعلیم کے اثر کو برباد کرنے والی قوّت سامنے آتی ہے یہ انسان جھٹ اپنی اصلی طبیعت پر لوٹ آتا ہے۔

اگرچہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی یہ فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان عام حالات میں رہے تو اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن تعلیم و تربیت سے جو اس کی طبیعت کے اندرونی مخزن تک پہنچ جائے فطرت بدل بھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بڑی محنت چاہیئے جو عام طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہر ایک انسان کی ذہنیت معیّن کرنے کے لئے اس حصّے کو زیادہ سامنے رکھنا چاہیئے کسی سوسائٹی میں عارضی طور پر رہ کر انسان نے خاص رنگ

اختیار کر لیا ہو یا علمی جماعت میں رہ کر اس نے اپنے نئے نظریات پیدا کر لیے ہوں۔ فقط انہی پر نظر کر کے انسان ذہنیتوں کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ منتظم افسر کا کمال یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے نیچے کام کرنے والوں کی اس نہ بدلنے والی فطرت کا مطالعہ کرے۔ اسی حالت میں اس کا انتظام اچھا اور مکمل ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے نیچے کام کرنے والوں سے اس کام کی امید نہ رکھے گا جو ان سے بن نہ پڑے یا ان کی اس فطرت کے خلاف ہو۔ اگر وہ یہ باتیں سمجھ لے تو اس کی نوّے فیصدی تجویزیں یقیناً کامیاب رہیں گی۔ جو لوگ اس فطرت سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور انسان کی عارضی بنی ہوئی فطرت ہی کا علم حاصل کرنا کافی سمجھتے ہیں اُن کا انتظام جلدی برباد ہو جاتا ہے۔ اجتماعی نظام میں اگر ایک کے بعد دوسرا سمجھدار افسر پیدا ہوتا رہے تو سلطنت بن جاتی ہے۔ اور اگر اس سلسلے میں ایک بھی ناسمجھ آدمی اعلیٰ انتظام کا مالک بن جائے تو وہ بنی بنائی سلطنت تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسان کی فطرت کا مطالعہ اور اُس کے بدلنے والے اور نہ بدلنے والے

صفتوں کی الگ الگ واقفیت پیدا کرنا کامیابی حاصل کرنے کے لئے اور سوسائٹی میں اعلیٰ درجے کا نظام پیدا کرنے کے واسطے نہایت ضروری ہے تاکہ جو آدمی جس کام کے لائق ہے اُسے اسی کام میں لگایا جائے۔

جبلّت نہیں بدلتی | اس باب میں ہماری توجّہ زیادہ تر اس روایت کی طرف ہے جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے بتائی جاتی ہے۔ جس کے الفاظ یہ بیان کئے جاتے ہیں۔ اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل تغیر عن خلقہ فلا تصدقوہ فانہ یصیر الی ما جبل علیہ (یعنی جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کا یقین کر لو۔ لیکن جب سنو کہ کسی آدمی کی جبلّت بدل گئی ہے تو اس کا یقین نہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ آخر وہ اپنی جبلّت کی طرف لوٹ آئے گا)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ الا ان بنی آدم خلقوا علی طبقات شتّی فمنہم من یولد مومنا۔ (یعنی دیکھو! بنی آدم مختلف درجوں میں پیدا کئے گئے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو پیدا ہی مومن ہوتے ہیں) (یہ روایت بہت لمبی ہے اس کے آگے بیان آتا ہے کہ بعض مومن پیدا ہوتے ہیں اور مومن ہی مرتے ہیں اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں اور کافر ہی مرتے ہیں۔ بعض کافر پیدا ہوتے ہیں اور مومن ہو کر مرتے ہیں اس حدیث میں آپ نے اُن کے غضب اور اپنا حق وصول کرنے کے طبقے

بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ بعض آدمی ہوتے ہیں جنہیں بڑی جلد ہی غُصّہ آتا ہے۔ اور جلد ہی صاف ہو جاتے ہیں بعض ایسے ہیں کہ انہیں غُصّہ جلد آتا ہے۔ لیکن ان کا دل دیر میں صاف ہوتا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ غُصّہ دیر میں آتا ہے اور صاف جلد ہو جاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انہیں غُصّہ بھی دیر میں آتا ہے اور وہ صاف بھی دیر میں ہوتے ہیں۔ دوسری روایت اپنا حق وصول کرنے کے بارے میں ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنا حق لینے میں سخت ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کا حق دینے میں بھی سخت ہوتے ہیں۔ بعض دونوں معاملات میں نرم ہوتے ہیں۔ بعض ایک میں نرم اور دوسرے میں سخت۔ یہ چار قسمیں ہو گئیں۔)

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ الناس معادن کمعادن الذهب والفضة (یعنی جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں۔ ایسے ہی انسانوں کی کانیں ہیں یعنی کسی کان سے خاص درجے کا سونا نکلتا ہے اور دوسری سے کم درجے کا سونا نکلتا ہے ویسے ہی لوگوں کی جماعتیں ہوتی ہیں۔ اچھی جماعت کا آدمی اچھا اور بُری کا بُرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ بھی فرماتا ہے کہ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (یعنی ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق کام کرتا ہے[۵]) یعنی اس کی فطرت میں جو استعداد رکھی گئی ہے وہ اس کے مطابق

---

[۵] سورہ بنی اسرائیل : ۸۴

کام کر سکتا ہے۔

انسان کی ساخت کا تجربہ اگر آپ چاہتے ہوں کہ فطرت انسانی کی جو سمجھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے اور ان حدیثوں کا جو مطلب ہمیں سمجھایا گیا ہے وہ معلوم کریں تو جو بات ہم بتاتے ہیں اسے پورے غور سے سمجھ لیجئے۔

ملکی قوت کے درجے انسان میں ملکی قوّت دو درجوں میں پیدا کی گئی ہے۔

(۱) پہلا درجہ ملاءِ اعلیٰ کے درجے کے مناسب ہے۔ جن کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے علموں سے پورا پورا رنگ حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان صفتوں کی باریکیوں کو پہچان لیتے ہیں۔ جن کا نظامِ عالم کے چلانے میں دخل ہے اور جو نیا نظام قائم کرنا مقصود ہوتا ہے وہ اُسے ہر پہلو سے مکمل طور پر سمجھ لیتے ہیں اور پھر اُسے عمل میں لانے میں اپنی ساری ہمت صرف کر دیتے ہیں۔ تو جن آدمیوں میں اعلیٰ درجے کی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اُسی طرح کرتے ہیں اور ایسے ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں۔

(۲) دوسرے درجے کی ملکیت وہ ہے جو نچلے درجوں کے فرشتوں کی شان کے لائق ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اُوپر سے جو خواہش آتی ہے۔ وہ اُسی سے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس نظام کا پورا علم نہیں

ہوتا اور نہ اُن کی ہمت اسے وجود میں لانے کی طرف از خود متوجّہ ہوتی ہے۔ اور نہ اُنہیں اُوپر کے درجے کے فرشتوں کی طرح اللہ تعالےٰ کے اسماء اور صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ البتہ ان میں نورانیت ضرور ہوتی ہے اور وہ حیوانی ناپاکیوں اور نجاستوں سے الگ رہ سکتے ہیں بعض انسان بھی ایسے ہی ہوتے ہیں یعنی وہ خود تو کوئی نظام نہیں سوچ سکتے لیکن اچھّا نظام سوچنے والوں سے اثر لے کر وہ اُن کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں۔

بہیمی قوّت کے درجے | اسی طرح بہیمیت (حیوانی قوّت) بھی انسان میں دو درجوں میں ظاہر ہوتی ہے:۔

(۱) پہلا درجہ شدید بہیمیت کا ہے یعنی طاقتور اور زوردار حیوانیت کا جیسے نر جانور جو پوری غذا کھائے اور پوری تدبیر کے ساتھ پرورش پائے اُس کا جسم بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ نہایت مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے اُس کی آواز بہت اونچی ہوتی ہے۔ حملہ کرتا ہے تو بڑے زور سے کرتا ہے جس کام کا ارادہ کر لیتا ہے اُسے کئے بغیر نہیں ٹلتا۔ اور اُس کی طبیعت میں فخر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اپنے ہم جنسوں میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اس کا غصّہ بھی بڑے زور کا ہوتا ہے۔ اس میں مادہ سے ملنے کی قوّت بھی زیادہ ہوتی ہے اور وہ ہر ایک پر اپنا غلبہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ بڑے دل والا ہوتا ہے۔ جس انسان میں شدید بہیمیت ہو اس

میں بھی ایسی ہی باتیں پائی جاتی ہیں۔

(۲) بہیمیت کا دوسرا درجہ کمزور ہونا ہے۔ جیسے خصّی ناقص اعضا والا جانور جو بھوک اور نامناسب تدبیر میں پرورش پائے۔ اس کا جسم کمزور ہوتا ہے۔ آواز باریک ہوتی ہے۔ حملہ کرنے میں بھی مریل سا ہوتا ہے۔ وہ بزدل اور بے ہمّت بھی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں پر غلبہ پانے اور فتح حاصل کرنے کا خیال بھی جی میں نہیں لاتا۔ جس انسان میں بہیمیت کمزور ہو اس میں ایسے ہی اوصاف ہوں گے۔

جبلّت اور تربیّت — ملکیّت اور بہیمیت کے جو دو دو درجے مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی درجہ انسان میں اس کی جبلّت کے مطابق پایا جاتا ہے۔ پھر تعلیم اور تربیت سے وہ جبلّی استعداد مضبوط یا کمزور ہوتی رہتی ہے یعنی ایک انسان کی جبلّت میں ملاء اعلیٰ کی سی ملکیّت موجود ہے۔ لیکن اسے کسی ایسے آدمی کی صحبت حاصل نہیں ہوئی جس نے کسی نبی سے تعلیم پائی ہو۔ تو یہ انسان نبی سے تعلیم پائے ہوئے انسان سے دوسرے درجے پر رہے گا۔ کیونکہ اس میں ملکی قوت بھی زیادہ ہے اور اچھی سوسائٹی کی تعلیم اور تربیت بھی اسے حاصل ہوگئی ہے ایسے ہی جس انسان میں طبعی طور پر بہیمی قوت تو ہے لیکن اس کی مشق اور ترقی کا سامان اسے حاصل نہیں ہے تو یہ شخص اس آدمی سے

جسے اپنی بہیمیت کو ترقّی دینے کا سامان حاصل ہے دوسرے درجے پر رہے گا۔

ملکیت اور بہیمیت کس کس طرح جمع ہوتی ہیں

کسی انسان میں یہ دونوں قوتیں دو طرح پر جمع ہوسکتی ہیں :-

(۱) پہلی قسم کا نام تجاذب ہے۔ اس میں ہر ایک قوّت اپنے تقاضے کو حاصل کرنے میں پورا پورا زور لگاتی ہے اور ترقی کا جو آخری نقطہ اس کے ذہن میں ہوتا ہے اُس تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور اپنے طبعی نظام کو قائم رکھتی ہے۔ جب ملکیت اور بہیمیت میں سے ہر ایک کی خواہش اُس درجے کی ہوگی تو ضرور اُن میں کھینچا تانی ہوگی۔ اگر ملکیت غالب آگئی تو بہیمیت کے آثار کمزور ہو جائیں گے۔ اور اگر بہیمیت غالب آگئی تو ملکیت چھُپ جائے گی۔

(۲) دوسری قسم اصطلاح کہلاتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملکیت اپنے اصلی تقاضے سے نیچے اُتر آتی ہے۔ اور ایسے کاموں پر راضی ہو جاتی ہے۔ جس میں بہیمیت بھی مل کر کام کرسکتی ہے مثلاً عقل، سخاوت، عفّت (بُری باتوں سے پرہیز کرنا) اپنے ذاتی نفع پر نوعی نفع کو ترجیح دینا۔ جو چیز ابھی ابھی حاصل ہونے والی ہے اُس پر بس نہ کرنا بلکہ آئندہ کا بندوبست بھی کرنا۔ تمام باتوں میں پاکیزگی کو پسند کرنا۔ اس میں وہ بہیمیت کے تقاضوں کا بھی کچھ خیال رکھتی ہے۔ اُدھر بہیمیت

اپنے تقاضوں کو نرم کر دیتی ہے۔ اور رفاہِ عامّہ کے کاموں میں ملکیت کی شریک ہو جاتی ہے۔ جو رائے کلّی کے قریب ہوں یعنی وہ اپنے ذاتی فائدوں کو بھلا دیتی ہے۔ اگر وہ خاص عام مصلحت کے کاموں کا تصوّر نہیں کر سکتی تو وہ اس کے خلاف باتوں کو بھی سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس نقطے پر دونوں میں صُلح ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح ایک ایسا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جس میں دونوں کے تقاضے لڑتے نہیں۔

دونوں کے جمع ہونے کے چار درجے ملکیت اور بہیمیت کے اس طرح آپس میں ملنے سے انتہائی، وسطی، اور انتہا کی طرف مائل اور وسط کی طرف مائل درجے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان سے بے انتہا قسمیں اور درجے پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن بڑی بڑی قسمیں آٹھ ہوتی ہیں :۔

تجاذب کی حالت میں (ا) ملکیت اور بہیمیت کے تجاذب کی شکل میں جمع ہونے سے :۔

(۱) اُونچے درجے کی ملکیت اور اُونچے درجے کی بہیمیت ،

(۲) اونچے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت ،

(۳) نچلے درجے کی ملکیت اور زوردار بہیمیت ،

(۴) نچلے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت ،

مصالحت کی حالت میں (ب) ملکیت اور بہیمیت کے صلح کے ساتھ جمع ہونے سے :۔

(۱) اُونچے درجے کی ملکیت اور زوردار بہیمیت،
(۲) اُونچے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت،
(۳) نچلے درجے کی ملکیت اور زوردار بہیمیت،
(۴) نچلے درجے کی ملکیت اور کمزور بہیمیت،

پھر ان میں سے ہر ایک قسم کی خاصیتیں الگ الگ ہیں +

جو شخص ان آٹھوں قسموں کے احکام یعنی خاصیتیں سمجھ لیگا وہ انسانیت کے بہت سے مشکل مسئلے حل کر کے اطمینان پا لے گا۔ (یعنی ظاہر میں سب انسان ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں اور ایک ہی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے ایک عالم کو پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جب وہ اُن باتوں کو جو اُوپر بیان کی گئی ہیں اچھی طرح سمجھ لے۔ تو اُس کے دماغ میں اِس قسم کی کوئی پریشانی نہیں رہے گی) ہم یہاں وہی باتیں بیان کریں گے۔ جن کی ہمیں آگے چل کر ضرورت ہوگی۔ ان قسموں کی پوری تفصیل بیان کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے +

ان حالتوں پر مختصر تبصرہ | مذکورہ بالا قسموں کے انسانوں کی مختصر سی خاصیتیں یہ ہیں:۔

(۱) جو شخص زوردار بہیمیت کا مالک ہوگا۔ خصوصاً جو تجاذب والا ہوگا اُسے زیادہ ریاضت اور مشقت کا حکم دیا جائے گا۔

مثلاً لمبے عرصے کے لئے روزے رکھنا۔ اگر کسی نبی کی اُمّت کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ اُسے لمبے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ لوگ زوردار بہیمیت والے ہونگے۔ لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عام مسلمانوں کو اس کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ آج کل بہیمیت اس زور کی نہیں ہے جس زور کی پہلے زمانے میں تھی +

(۲) کمالات حاصل کرنے میں وہ شخص بہت آگے بڑھ جائیگا جس کی ملکیت اونچے درجے کی ہوگی۔ جس شخص کی بہیمیت کی اُس کی ملکیّت کے ساتھ صلح ہوگی وہ عمل میں بھی بہت آگے بڑھا ہوا ہوگا۔ اور اجتماعی کام بھی نہایت اعلےٰ درجے کے کرے گا۔ اُس کے اخلاق و عادات بھی بہت پاکیزہ ہوں گے۔ جو صاحب تجاذب ہو (یعنی جس میں تجاذب کی حالت پائی جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) اور اپنی ملکیّت کو بہیمیت کے پنجے سے نکال لے وہ بہت علم والا ہوگا۔ لیکن وہ عمل اور ادب کی زیادہ پیروی نہیں کرے گا کیونکہ عمل میں بہیمیت زیادہ کام کرتی ہے۔ اور وہ دب کر رہ گئی ہے +

(۳) جس شخص کی بہیمیت کمزور ہوگی وہ بڑے بڑے کام نہیں

کرسکے گا۔ ایسے آدمیوں میں سے جس شخص کی ملکیت اونچے درجے کی ہوگی وہ سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالےٰ کی طرف خاص طور پر متوجّہ ہوجائے گا۔ اور جس کی ملکیت بھی کمزور ہوگی وہ اگر بہیمیت کے پنجے سے چھوٹ سکے تو آخرت کی طرف متوجّہ ہونے کی خاطر بڑے بڑے کام چھوڑ دے گا اور اگر ملکیت اور بہیمیت دونوں ایک ہی درجے کی کمزور رہیں تو سستی اور آرام طلبی کی خاطر بڑے بڑے کاموں سے جی چُرا لے گا۔

(۴) جس شخص کی بہیمیت زوردار ہے وہ بڑے بڑے کام کرسکتا ہے۔ اب اگر اُس کی ملکیت بھی اُونچے درجے کی ہے تو وہ بہت بڑی بڑی حکومتیں چلائے گا۔ اور وہ سب کام کرے گا جو عمومی فائدے کے ہوں یعنی اگر حکومت چلانے کا موقعہ ہاتھ نہ آئے تو وہ علمی اور اخلاقی لحاظ سے ایسی مرکزیت پیدا کرے گا کہ اسی راستے سے وہ لوگوں پر حکومت کریگا۔ اور جس کی ملکیت کمزور اور بہیمیت زوردار ہوگی وہ لڑائیوں میں شدّت دکھائیگا۔ اور بڑے بڑے بوجھ اُٹھانے میں سب سے آگے ہوگا۔

(۵) تجاذب والے چاروں قسم کے آدمی جب بہیمیت کی طرف پلٹ پڑتے ہیں تو فقط دُنیا داری کے کام کرتے ہیں۔ اور جب ملکیت کی طرف جھک پڑتے ہیں تو صرف دینی کام کرتے ہیں۔

اور اپنے نفس کو گندی عادتوں سے پاک کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

(۶) مصالحت والے لوگ دونوں کام ایک ہی وقت میں اکٹھا کرتے ہیں۔ اب اگر ان کی ملکیت اونچے درجے کی ہے تو دین اور دُنیا کی حکومت ایک ہی وقت میں چلاتے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ کا ارادہ پورا کرتے ہیں اور اس کے کام کرنے کا آلہ بن جاتے ہیں اور اس دُنیا کا فائدہ سامنے نہیں رکھتے۔ اللہ کے کام اس قسم کے ہوتے ہیں۔ جیسے خلافت یعنی کل قوم، حکومت اور ملت کی امامت یعنی سوشل اصلاح میں مرکزیت حاصل کرنا۔ انبیاء اسی قسم کے لوگوں میں سے ہوتے ہیں اور اُن کے وارث بھی اسی قسم میں سے ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ اصل میں انسانیت کے ستون اور سیاسی لیڈر ہوتے ہیں اور اپنے لوگوں میں حکومت کرتے ہیں۔ دین کے معاملات میں جن لوگوں کی اطاعت کرنی چاہیے وہ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ صاحب اصطلاح ہوتے ہیں اور ان کی ملکیت بہت اونچے درجے کی ہوتی ہے۔ اور اس قسم کے حاکموں کی اطاعت اور پیروی کرنے والا وہ طبقہ ہوتا ہے جن کی ملکیت نچلے درجے کی ہوتی ہے۔

جن لوگوں کی ملکیت نچلے درجے کی ہوتی ہے وہ علموں کو ان کی صورت اور شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور تجاذب والے لوگ

آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جب تک طبیعت کے اندھیروں میں رہتے ہیں کوئی اعلیٰ قانون نہیں چلا سکتے اور جب طبیعت پر غالب آجاتے ہیں تو اگر وہ بلند خیال ہوں تو وہ قانون کی فقط روح کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اُن کی صورتوں کی پروا نہیں کرتے اور اللہ تعالےٰ کی صفتوں کے باریک مسئلوں کی معرفت حاصل کرنا اور اپنے اندر معرفت کا رنگ پیدا کرنا ان کی سب سے بڑی کوشش ہوتی ہے۔ اگر ان کی ملکیت اُونچے درجے کی نہیں ہے تو وہ ریاضتوں اور وردوں وظیفوں کا اہتمام کرتے ہیں اور ملکیت کی روشنی پیدا ہوجانے سے مثلاً کشف حاصل ہوجانے یا کسی کے دل کی بات معلوم ہوجانے یا دُعائیں قبول ہوجانے وغیرہ سے بہت خوش رہتے ہیں۔ وہ شرعی قانونوں میں سے اپنی طبیعت کے تقاضے سے فقط اُن چیزوں کو لے لیتے ہیں جن میں طبیعت مغلوب کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہو یا جن سے اُوپر کے طبقوں سے نور حاصل کرنے کا راستہ معلوم ہوتا ہو (اس کے سوا باقی شرعی حکموں کی پابندی صرف عادت کے طور پر ہوگی۔ اُن کی طبیعت میں ان کا شوق پیدا نہیں ہوگا)

یہ وہ قاعدے ہیں جو میرے پروردگار نے مجھے خاص طور پر دیئے ہیں۔ جو شخص انہیں اچھی طرح سے سمجھ لے گا ہر زمانے کے اللہ والوں کے احوال اس پر روشن ہوجائیں گے۔ وہ ان کے کمال کی انتہا

کو معین کریگا۔ اور وہ اپنے دل کے حالات جن اشاروں میں ظاہر کرتے ہیں اُن کا صحیح مطلب بھی سمجھ لے گا۔ اور وہ روحانی دُنیا کے راستے جس طرح طے کرتے ہیں اُن کی کیفیت اور اُن کے قاعدے معلوم کرلے گا۔ وذٰلك من فضل اللہ علینا وعلی النّاس ولکن اکثر الناس لا یشکرون (یہ چیز اللہ کا فضل ہے ہم پر اور لوگوں پر لیکن اکثر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے)۔

دسواں باب (۱۰)

انسان کے دل میں "خواطر" کی پیدائش

دسواں باب (۱۰)

• انسان کے دل میں "خواطر" کی پیدائش

انسان جن ارادوں کو اپنے دل میں پاتا ہے اُنہی کے مطابق اُسے کام کرنے کی ہمت اور آمادگی ہوتی ہے۔ ضرور اُن ارادوں کے کچھ نہ کچھ اسباب ہونگے۔ انسان جب تک کسی کام کو اپنے لئے مفید نہ سمجھ لے اُس کی قوتیں اُس کے کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتیں۔ یہ "مفید سمجھنا" کبھی تو فوراً ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے اور اسے سُن کر فوراً مان لیا لیکن یہ حالت انسان کے لئے قابلِ تعریف نہیں ہے۔ اس طرح کے

لوگ انسانی سوسائٹی میں ادنٰے درجے کے گنے جاتے ہیں۔ کبھی ایسے انسان بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ انہیں کسی بات کی خوبی لاکھ سمجھاؤ وہ اُسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ طبقہ بھی کسی کام کا نہیں ہے۔ انسانی سوسائٹی کا وہ طبقہ جس کے کاموں سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانیت کیا ہوتی ہے وہ اِن کا درمیانی طبقہ ہے۔ یہ طبقہ جب تک کسی چیز کی خوبی کو خود نہ سمجھ لے۔ اُسے اچھا نہیں سمجھتا۔ جو چیز کسی کام کی خوبی منوا سکتی ہے وہ یکلخت سمجھ میں نہیں آجاتی۔ بلکہ اُس کام کے متعلق پہلے چھوٹے چھوٹے خیالات پیدا ہوتے ہیں جیسے کسی آدمی کو کامیاب ہوتے دیکھا اُس کی طرف توجہ ہوتی تو اُس چیز کے اچھا ہونے کے متعلق ایک خیال دل میں پیدا ہوا اور گزر گیا۔ پھر کسی سے اُس چیز کے متعلق کچھ تعریفی باتیں سُنیں اور پہلے کی نسبت ذرا زوردار خیال پیدا ہوگیا۔ ان چھوٹے چھوٹے خیالوں کو "خاطر" کہتے ہیں (خاطر کی جمع خواطر آتی ہے) جب خواطر بار بار دل میں آتے رہتے ہیں تو انسان اُس کام کو اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ پھر اُس کی سب قوتیں اُس کام کو سرانجام دینے میں لگ جاتی ہیں۔ پس انسان کی ذہنیت کی تحلیل (Analysis) میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

جتنے کام انسان کرتا ہے۔ اُن کا قریبی سبب یہی خواطر ہوتے ہیں۔

خواطر کے پیدا ہونے کے اسباب

(۱) اِنسان کی جبلّت

واضح رہے کہ انسان کے دل میں ایسے چھوٹے چھوٹے خیالات اُٹھتے ہیں۔ جو اُسے کسی کام پر اُکساتے ہیں (ان چھوٹے چھوٹے خیالات کو جو ارادہ پکّا ہونے سے پہلے انسان کے دماغ میں آتے جاتے رہتے ہیں خواطر کہتے ہیں) ضروری ہے کہ ان خواطر کے بھی اسباب ہوں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالےٰ کا عام قاعدہ ہے (کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اب عقلی غور و فکر اور تجربہ دونوں متفق ہیں کہ جن اسباب سے یہ دلی خواطر پیدا ہوتے ہیں وہ بہت سے ہیں ان میں سب سے بڑا سبب انسان کی وہ جبلّت یا فطرت ہے جس پر وہ پیدا کیا جاتا ہے اس کا ذکر جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث میں آیا ہے) ہم پہلے (پچھلے باب میں) کر آئے ہیں[۱]۔

[۱] اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:- اذا سمعتم بجبل زال عن مکان فصدقوہ واذا سمعتم برجلٍ تغیر عن خلقہ فلا تصدقوبہ فانہ یصیر الیٰ ما جُبل علیہ (یعنی جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اُسے چاہے مان لو، لیکن جب تم سُنو کہ کوئی شخص اپنی فطرت سے بدل گیا ہے تو یہ بات کبھی نہ مانو کیونکہ وہ پھر اپنی فطرت کی طرف لوٹ جائے گا)۔

(۲) انسان کا مزاج | دوسرا سبب انسان کا طبعی مزاج ہے جو کھانے پینے وغیرہ کے طبعی حالات سے بدلتا رہتا ہے۔ اس مزاج کو بھی خواطر (چھوٹے چھوٹے ذہنی خیالات) کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے۔ جیسے بھوکا انسان کھانا مانگتا ہے (یعنی اس کے دل میں کھانے کے خواطر پیدا ہوتے ہیں) اور پیاسا پانی مانگتا ہے (اس کے دل میں پانی پینے کے خواطر پیدا ہوتے ہیں) جس جوان آدمی کی طبیعت پر شہوت کا غلبہ ہو اُسے عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان ایسی غذائیں کھاتا ہے جن سے قوت جنسی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ اس آدمی کا رجحان بھی عورتوں کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور وہ جنس لطیف ہی کی باتیں کرکے خوش ہوتا ہے چنانچہ اکثر اوقات وہ بعض کام انہی خیالات سے متاثر ہوکر کر گزرتا ہے۔ کبھی انسان ایسی غذا کھاتا ہے جس سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ اس سے اُس میں قتل کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے ایسی باتوں پر غصّہ آنے لگتا ہے جن پر دوسرے لوگ خفا نہ ہوں۔ اگر دونوں قسم کے انسان ریاضت کریں مثلاً روزہ رکھیں۔ رات کو تہجّد پڑھا کریں یا وہ بوڑھے ہو جائیں یا وہ کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو اکثر اُن کا مزاج بدل جائیگا۔ اب اُن کے دل نرم ہو جائیں گے (یعنی کسی

کو قتل کرنے کی جرأت نہ کریں گے نہ انہیں جلد غصّہ آئے گا) اور اُن کی طبیعتیں پاکیزہ ہو جائیں گی۔ اور اُن کے دل میں گندے خیالات نہیں آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کام کرنے کی قوت کے لحاظ سے بوڑھے اور جوان میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بوڑھے کو روزے کی حالت میں اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی بیوی کا بوسہ لے لے۔ لیکن اس قسم کی اجازت جوان کو حاصل نہیں ہے +

(۳) دل بستگی | انسان کے دل میں خواطر (چھوٹے چھوٹے خیالات) پیدا ہونے کا تیسرا سبب عادت اور دلبستگی ہے اس لیے جس شخص کا دل کسی چیز سے زیادہ لگ جاتا ہے اور چیزوں کی جو حالتیں اور شکلیں انسان کے دل پر چھا جاتی ہیں اُس کے اکثر خواطر انہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں (مثلاً ایک شخص کے دل میں وطن کی محبت ہے۔ وہ انسانی بہتری کے لئے جتنی کوشش کرے گا اُس کا دل اپنے وطن کی خدمت کی طرف زیادہ مائل ہو گا) +

(۴) روحانی میلان | چوتھا سبب انسان کا روحانی میلان ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی روح حیوانیت (بہیمیت) کے پنجے سے چھوٹ جاتی ہے۔ اُس حالت میں وہ فوراً حظیرۃ القدس میں پہنچ جاتا

ہے۔ اور وہاں سے اُسے کوئی نُورانی کیفیّت حاصل ہو جاتی ہے جس سے کبھی تو اچھے کاموں کی طرف طبیعت خود بخود رغبت کرنے لگتی ہے۔ کبھی اُس کا دل اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ کبھی کسی اُونچے درجے کے اچھے کام کرنے کا پختہ ارادہ پیدا ہو جاتا ہے +

(۵) شیطانی اثر | پانچواں سبب شیطانی طاقتوں کا اثر ہے۔ اس میں بعض کم درجے کے انسان شیطانی قوتوں سے اثر لے لیتے ہیں اور اُن کے رنگ میں کسی نہ کسی حد تک رنگین ہو جاتے ہیں۔ ان حالتوں سے انسان کے دل میں بُرے بُرے خیالات آتے ہیں اور ان خیالات کے آنے سے وہ بُرے کام بھی کر گزرتا ہے +

ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ | اب یہ سمجھنا آسان ہو جائیگا کہ انسان جو خواب دیکھتا ہے اُن کے اصول انسان کے دل کے خواطر (چھوٹے چھوٹے آنے جانے والے خیالات) کے اصول سے ملتے جُلتے ہیں یعنی جن اسباب سے انسان کے دل میں جاگتے میں خواطر پیدا ہوتے ہیں اُنہی اسباب سے سوتے میں خواب آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خواب کے لئے انسان کے دماغ میں صفائی آجاتی ہے اس لئے خواطر (خیالات) کی صورتیں اور شکلیں صاف نظر آنے لگتی ہیں (یعنی جاگتے میں انسان بہت سی چیزوں کی طرف توجّہ دیتا ہے اس لئے دماغ میں خیالات سرسری طور پر آتے جاتے رہتے ہیں اُس وقت انسان

کے ذہن میں اتنی صفائی نہیں ہوتی کہ خواطر "نظر" آنے لگیں۔ بلکہ گول مول قدروں کی طرح ایک چیز دل میں آجاتی ہے اور اپنا تھوڑا سا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن خواب میں یہ خیالات اتنے صاف صاف ہوتے ہیں کہ وہ نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً بیداری میں ایک اونچی ہمت والا انسان کوئی پروگرام سوچ لیتا ہے اور اس کی کامیابی کا یقین کر لیتا ہے۔ یہ یقین جاگتے میں تو گول مول سا ہوتا ہے۔ لیکن وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ بہت سے آدمی جمع ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے مل کر ایک قلعہ فتح کر لیا ہے۔ یہ گویا اسی خیال کی تصویر تھی جو اسے خواب میں نظر آگئی)+

ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:-

(۱) حدیثِ نفس یعنی انسان کے دل کے اندر کی بات +

(۲) شیطانی تخویف یعنی اچھے کاموں سے روکنے کے لیے شیطان واقعات کی بہت خوفناک صورتیں پیش کرنے لگتا ہے +

(۳) بشارت یعنی اچھے کام کرنے کی صورت میں انسان کی طبیعت میں خوشی پیدا کر دی جاتی ہے۔ اور کسی مشکل کے وقت آسانی ظاہر کرنے والا خواب آجاتا ہے +

نوٹ:- جس طرح ابن سیرینؒ نے خواب کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ نے بھی خواطر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(۱) جبلّت مزاج اور عادات کا تغیّر: یہ تینوں سبب ابنِ سیرینؒ کے حدیثِ نفس کے قائم مقام ہیں۔

(۲) ملاء اعلیٰ سے اثر لینا: یہ ابن سیرینؒ کی "بشارت" کی جگہ آتا ہے۔

(۳) شیاطین سے اثر لینا: یہ ابن سیرینؒ کے "شیطانی تخویف" کی جگہ ہے۔

گیارھواں باب (۱۱)

انسانی رُوح سے اعمال کا علاقہ

گیارھواں باب (۱۱)

اِنسانی روح کے ساتھ اعمال کا علاقہ

اِنسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ جس چیز کو وہ اپنا نہیں سمجھتی اُسے اپناتی بھی نہیں۔ اور جِس چیز کو وہ اپنا سمجھ لیتی ہے اُس سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتی بلکہ اُسے ساری دُنیا سے اچھا جانتی ہے۔ پھر وہ چیز انسان کی فطرت میں گھر کر لیتی ہے۔ اگر کسی انسان سے پوچھا جائے کہ کیا وہ اپنی اس نفسیاتی کیفیت کی تبدیلی پر راضی ہے؟ تو ہر ایک انسان کے دل سے جو فطری جواب

نکلے گا وہ یہی ہو گا کہ "نہیں"۔

اجتماع میں انسانیت کی تقسیم قوموں میں ہو جاتی ہے اور فرقے آپس میں چھوٹے بڑے عمل کے لحاظ سے مانے جاتے ہیں لیکن کسی چھوٹے سے چھوٹے فرقے کو دیکھئے وہ بھی اپنے آپ کو کسی بڑے سے بڑے فرقے سے کم نہیں مانتا۔ انسان کی ساری کائنات یہی ہے جسے وہ "میں" (انا:- Ego) سے تعبیر کرتا ہے۔ جو چیز اس کی "میں" کے اندر آجاتی ہے۔ وہ اس کی ہستی کا جز بن جاتی ہے۔ بیرونی چیزوں کا عارضی اثر جس طرح جلد ہو سکتا ہے اسی طرح جلد ختم بھی ہو جاتا ہے لیکن جو چیز انسانیت کے ساتھ ہمیشہ رہ سکتی ہے وہ وہی ہے جو اس کے اندر آجاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کو کوئی نیا علم سکھایا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس کی طبیعت میں جو استعداد موجود ہے اسے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اسے باہر سے کوئی علم دینا ممکن نہیں ہے[1]۔

---

[1] چنانچہ "تعلیم" کے لئے انگریزی لفظ (Education) یہی تصور ظاہر کرتا ہے (E = باہر، Duct = نکالنا، یعنی جو چیز انسانی استعداد کے اندر ہے اسے کام میں لانا) (مرتب)۔

یہ ذہنیت کے بڑے بڑے ماہر لوگوں کی رائے ہے جیسے جماعت میں استاد طلبہ کو ایک ہی تعلیم دیتا ہے۔ جن طلبہ کی استعداد اس تعلیم کے مطابق ہوتی ہے وہ تو اس سے فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر جن کی استعداد اس تعلیم کے مطابق نہیں ہوتی وہ اس سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ماہر اُستاد وہی مانا جاتا ہے جو طالب علم کی استعداد کا صحیح اندازہ لگا کر اُسے اس علم میں ماہر بنا دے۔

انسانیت کے اس خاصے کی مثالیں دوسری نوعوں میں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ جوار، جَو اور گندم کو بویا جائے گا تو جو خاصیتیں ان کے اندر رکھی گئی ہیں وہی ظاہر ہوں گی۔ اور جو بویا جائے گا وُہی اُگے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نئی قسم کا پانی دے کر جَو سے جوار پیدا کر لی جائے۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالےٰ کی پیدا کی ہوئی فطرت کے عام قانون کے اندر نہیں ہے۔ ذہنیت کے عالم اس مسئلے کو اسی قسم کی مثالوں سے ذہن میں بٹھا دیتے ہیں۔

جب انسان اس بات کو سمجھ لے کہ وہ اُتنی ہی ترقی کر سکتا ہے جتنی اس کے اندر استعداد موجود ہے۔ تو اس صورت میں اگر اُسے اچھا رہبر مل جائے تو وہ بہت ترقی کر سکتا

ہے۔ مگر غلطی یہ ہوتی ہے۔ کہ لوگ اپنی استعداد کے مطابق سر توڑ
کوشش نہیں کرتے۔ قابو پائی ہوئی جماعتوں کے پراپیگنڈہ
میں آجاتے ہیں۔ دُنیاوی زندگی میں بعض چیزیں ایسی پیش
آتی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی طبیعت اس قاعدے کو بھلا
دیتی ہے۔ لیکن مرنے کے بعد کی زندگی میں فقط یہ اصول
کام کرتا ہے۔ اس زندگی میں انسان ہر قسم کے بیرونی اثروں
سے آزاد ہو کر فقط اپنی طبیعت کے اندرونی محرکات
(Stimuli) کو عمل میں لائے گا۔ یہ محرکات ان
کاموں کا نتیجہ یا جوہر ہوں گے۔ جو انسان اس دُنیا میں
کرتا رہا تھا۔

عملوں کے نتیجے باقی رہتے ہیں | قرآن حکیم میں آیا ہے۔ وَكُلَّ اِنسَانٍ اَلزَمنٰهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخرِجُ لَهُ يَومَ القِيَامَةِ كِتَابًا يَلقٰهُ مَنشُورًا ۝ اِقرَأ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفسِكَ اليَومَ عَلَيكَ حَسِيبًا۝ (یعنی ہم نے ہر ایک انسان کی گردن میں اس کا نصیب چپکا دیا ہے۔ اور اور قیامت کے دن ایک لکھا ہوا مفصّل بیان ظاہر کریں گے جو اسے ملے گا۔ پھر اُسے کہا جائے گا کہ اس نوشتے کو خود پڑھ لو۔ آج اپنے نفس کا حساب لینے کے لئے تم خود ہی کافی ہو)[۵]

---

۵ سورہ بنی اسرائیل ۱۳:۱۴

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خدا تعالےٰ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ قیامت کے دن فرمائے گا کہ " جو کچھ تم یہاں دیکھ رہے ہو۔ یہ سب تمہارے ہی اعمال (کرم) ہیں جنہیں مَیں تمہارے لئے محفوظ رکھتا ہوں پھر مَیں تمہیں ان کا پُورا پُورا بدلہ دُونگا۔ اب اگر کوئی شخص اپنے کاموں میں اچھی بات پائے تو اُسے اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے (یعنی اللہ کی قدرت نے اس کی فطرت کو ابتدائی درجے میں ایسا موقعہ دیا کہ اس کے کاموں کا اچھا نتیجہ نکلا) اور جو شخص اچھی بات نہ پائے وہ اپنے نفس کے سوا اور کسی کو ملامت نہیں کر سکتا (کیونکہ قدرت نے اُسے فطرت دی تھی اُسے ترقّی دینے میں اُس شخص نے قصور کیا)

[اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر انسان اپنی فطرت کے مطابق سیدھا ترقی کرے تو اخیر میں اُونچے درجے پر پہنچ جانا ضروری ہے۔ جب کوئی شخص اس اُونچے نتیجے پر نہیں پہنچتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی فطرت کو ترقی دینے میں قصور کیا۔ انسان کو جتنا سرمایہ یعنی استعداد دی گئی تھی۔ اگر وہ اُس سے کام لیتا اور اُس میں بڑھاتا تو فائدے میں رہتا۔ جو شخص اس استعداد سے ٹھیک ٹھیک کام نہیں لیتا وہ گھاٹے میں رہتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کے

اندر تمنّا اور خواہش نفسانی پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کے اعضا اُسے اس خواہش کو سچّا کر دکھلاتے ہیں یا جھٹلا دیتے ہیں۔ یعنی اُسے پُورا کرنے میں مدد دیتے ہیں یا نہیں دیتے۔ یہ اُن کا اپنا کام ہے +

روح عملوں کا منبع ہے جاننا چاہیئے کہ جس قدر کام انسان پکّے ارادے سے کرتا ہے۔ اور جو اخلاق انسان میں پکّے ہو جاتے ہیں ان کا بیج انسانی رُوح میں سے نکلتا ہے (یعنی اُن کی استعداد خود انسانی رُوح کے اندر موجود ہوتی ہے۔ وہ کوئی چیز باہر سے قبول نہیں کرتی) پھر پھیلنے کے بعد انسانی رُوح کی طرف ہی واپس آجاتا ہے۔ یعنی ان افعال اور اخلاق کا نتیجہ بعد میں انسانی رُوح ہی کے اندر محفوظ ہو جاتا ہے چونکہ وہ نکلنے کے وقت چھوٹی چیز تھی اور واپسی کے وقت پھیل گئی اس لئے وہ واپس آکر نفس کے دامن کے ساتھ لٹک جاتی ہے یا انسان کے عمل اور اخلاق کا نتیجہ انسان کی رُوح پر پھیل جاتا ہے۔ اور اس کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے +

عمل کی پیدائش یہ جو ہم نے کہا ہے کہ انسان کے اعمال اور اخلاق اس کے نفس ہی سے نکلتے ہیں تو اس کی حکمت وہی ہے جو آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں۔ یعنی ملکیت اور بہیمیت اور ان کی ملاوٹ سے انسانی جبلّت کی بہت سی قسمیں بن جاتی ہیں۔ اور ہر ایک قسم کی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔ اور انسان کے طبعی مزاج کے غلبے، فرشتوں کے

اثر اور شیطانوں کے اثر اور دُوسرے اسباب سے انسان کے دل میں جو خواطر (چھوٹے چھوٹے آنے جانے والے خیالات) پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سب کا اثر اصل میں انسان کی اپنی جبلّت یا فطرت کے مطابق ہوتا ہے یا اس مناسبت کے مطابق ہوتا ہے جو انسان کی طبیعت کو ان اسباب کے ساتھ ہوتی ہے (یعنی انسان کے اندر جو استعداد موجود ہے اصل میں بیرونی اسباب سے وہی اثر لیتی اور کام کرتی ہے) اب یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ انسان کے تمام کاموں اور خُلقوں کا اصل مادہ انسان کی طبیعت یا فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے۔ پھر وہ یا تو کسی واسطے (Medium) کے اثر سے عمل میں آتا ہے یا بغیر واسطے کے عمل میں آجاتا ہے (اگر استعداد مضبوط اور طاقتور ہے تو وہ خود عمل کرتی ہے۔ اگر ذرا کمزور ہے تو بیرونی اثرات اُسے اُکساتے ہیں۔ پہلی صورت بغیر واسطے کی ہے۔ اور دوسری واسطے کے ذریعے سے) اس کی مثال مخنّث بچّے کی سمجھئے۔ کہ پیدائش کے وقت ہی سے اس کا مزاج ڈھیلا اور کمزور ہوتا ہے۔ نفسیات کا ماہر جانتا ہے کہ اگر اس بچّے نے اپنی فطرت پر پرورش پائی اور جوان ہوگیا تو وہ ضرور عورتوں کی سی عادتیں اختیار کرلے گا۔ اور انہی کی طرح سجاوٹ کیا کرے گا اور انہی کے سے ڈھنگ اختیار کرلے گا۔ ایسے ہی جو بچّہ پیدائش کے وقت اچھی صحت والا ہو اور جسم بھی اچھا رکھتا ہو ایک

ڈاکٹر اسے دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بچّہ اپنے مزاج کے مطابق پرورش پا کر جوانی کو پہنچا اور اُسے کوئی خاص بیماری نہ لگ گئی، تو اُس کا جسم بڑا مضبوط ہوگا یا اگر بچپن ہی سے کمزور، نحیف اور دُبلا پتلا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ بڑا ہو کر بھی یہ دھان پان ہی ہوگا۔ یہ سب فیصلے اور قیاس اس لئے صحیح نکلتے ہیں کہ انسان کے اعمال اور اخلاق کا منبع اس کی جبلّت اور فطرت ہے۔ اس کی خاصیّتیں عام طور پر نہیں بدلتیں۔ اس لئے نفسیات کے ماہرین (Psychologists) اور ڈاکٹر (Pathologists) جو قیاس لگاتے ہیں وہ عموماً صحیح ہوتا ہے۔

عمل کا عَود | عَود یعنی لوٹ آنے کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب ایک کام کو بار بار کرتا ہے تو وہ نفس کی عادت بن جاتا ہے۔ پھر وہ اُسے آسانی سے کر سکتا ہے۔ اب اُسے ان کاموں کے کرنے میں کسی سوچ بچار اور محنت اور تکلّف کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کا نفس اُن کاموں کا اثر لے لیتا ہے اور اُن کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان بہت سے کاموں کے مجموعے سے جو اثر لیتا ہے اُس (اثر) میں اُن میں سے ایک ایک جنس کے ایک ایک کام کا اثر موجود ہوتا ہے۔ چاہے ایک حرکت کا اثر کتنا بھی باریک یا ہلکا کیوں نہ ہو اور ظاہر میں نظر

نہ آتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب ایک دفعہ ایک کام کر رہا ہے تو اُس کے ذہن پر اُس کام کے نتیجے کے طور پر ایک نقطہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطہ بہت ہی باریک ہوتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ لیکن جب انسان وہی کام بار بار کرتا ہے تو نقطہ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ آگے چل کر انسان کے لئے اس کام کا کرنا آسان ہو جاتا ہے (اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین پر بیل گاڑی کے گزرنے سے ایک نشان پڑ جاتا ہے۔ پھر جب گاڑی بار بار اس راہ سے گزرتی ہے تو گہرا راستہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ان لکیروں پر چلنا اس گاڑی کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ انسانی اجتماع کا نظام توڑنے والے فتنے انسانوں کے دلوں پر اس طرح اثر کرتے ہیں جیسے چٹائی بُننے میں ایک ایک تنکا دیا جاتا ہے۔ تو جس دل نے فتنے کا اثر قبول کر لیا اس پر سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اور جس دل نے اُسے قبول نہ کیا اس میں ایک سفید نقطہ پڑ جاتا ہے جیسے سنگ مرمر سفید ہوتا ہے۔ اب اس پر بدانتظامی کا خیال قیامت تک اثر نہ کریگا۔ اور دوسری جماعت جس کے دل اس بدنظمی کے پراپیگنڈہ کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے سیاہ دل لوگوں کی ہے جو گرد و غبار میں اٹے ہوئے بے پیندے کے بدھنے کی طرح ہیں۔ وہ نہ اچھا فکر لیتے ہیں نہ بُرے کو قبول

کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اب وہ وہی کام کرنے لگتے ہیں جو اُن کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ لوگ سیاہ دل اس لئے کہے جاتے ہیں کہ ان میں تمیز کی قوت بالکل مرجاتی ہے۔ اور وہ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ انسان جو ارادہ کرے وہ عقل کے مطابق کرے۔

عمل کا تشبث تشبث یعنی نفس کے دامن کے ساتھ عملوں کے لٹکنے کی کیفیت یہ ہے کہ انسان کا نفس شروع شروع میں ایسا پیدا کیا جاتا ہے جیسے سفید کاغذ، جس پر نہ کوئی تحریر ہے نہ کوئی رنگ لگا ہوا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی اندرونی قوتیں کام کرنا شروع کرتی ہیں اور اس میں رنگ بھرنا شروع ہوتا ہے۔ ہر پچھلی حالت پہلی حالت کی استعداد سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ایک ایک کڑی اپنی اپنی جگہ کام کرتی ہے کوئی ایک کڑی بھی آگے کی پیچھے اور پیچھے کی آگے نہیں ہو سکتی۔ نفس کی آج جو حالت ہے اس میں ہر پچھلے دن کے کام کا اثر موجود ہوتا ہے۔ خواہ وہ ایسا باریک اثر ہو کہ باہر کی چیزوں کی طرف توجہ ہونے کے سبب سے نفس اس کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکتا ہو۔ غرض انسان کے کام کا سلسلہ انسان کی اندرونی استعداد کے مطابق جاری رہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ انسان کی جس قوت سے عمل نکلتے ہیں وہ کسی

وجہ سے فنا ہو جائے جیسے ہم بوڑھے اور مریض کے ذکر ہیں بیان کر آئے ہیں (کہ ان کی نفسانی قوتیں فنا ہونے کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔ تو ان کے دماغ میں نفسانی خواہشیں پیدا نہیں ہوتیں اور نہ ان کے مطابق کام ہوتے ہیں) اسی طرح اگر حظیرۃ القدس سے کوئی زور کا اثر انسان کے نفس پر پڑتا ہے تو اس کا اندرونی نظام بدل جاتا ہے جیسے بوڑھے اور مریض کے طبعی اثرات سے بدل جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الحسناتِ یذھبن السیّئاتِ (نیکیاں بُرائیوں کو فنا کر دیتی ہیں)[1] نیز فرماتا ہے کہ لئن اشرکت لیحبطنّ عملک (اگر تو شرک کرنے لگے تو تیرے سارے کام برباد ہو جائیں گے)[2]

عمل کا احصاء | احصاء یعنی انسان کے عملوں کے محفوظ ہونے کا جو راز ہم نے اپنے ذوق سے معلوم کیا ہے وہ یہ ہے کہ عالم مثال کے اوپر کے طبقے میں ہر ایک انسان کی ایک صورت بنی ہوئی ہے۔ جو اس اوپر کے نظام کے اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ جو میثاق کا قصہ ہے[3] وہ بھی اُس عالم کی بات ہے۔ جب کوئی شخص وجود میں آتا ہے اُس

---

[1] ہود : ۱۱۴

[2] زمر : ۶۵

[3] اعراف : ۱۷۲

کی روحانی صورت جو "انسان اکبر" میں تھی اس مادی وجود پر طاری ہوجاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ مل کر ایک بن جاتی ہے۔ جب وہ اچھا عمل کرتا ہے تو اس کے اثر سے یہ صورت ایک پھیلاؤ محسوس کرتی ہے جس میں اس کے اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ عمل طبعی طور پر ہوتا ہے۔ اس صورت کے ساتھ اس کے عملوں کے تعلق کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ موت کے بعد کبھی تو یہ نظر آئے گا کہ اس کے عمل اس کے اوپر لپٹے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ہر ایک شخص اپنے اعمالنامے خود پڑھ لے گا۔[1] کبھی ایسا ہوگا کہ اعمال انسان کے ہر ایک عضو کے ساتھ لگے ہوتے ہوں گے۔ یہ وہ حالت ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ انسان کے بدن کے اعضاء اس کے کاموں کی گواہی دیں گے اور بولیں گے۔[2] انسان کے کرم جو صورت بھی اختیار کرتے ہیں وہ ایسی واضح اور صاف ہوتی ہے۔ کہ دیکھنے والا جھٹ بھانپ جاتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں اس عمل کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے۔ بعض اوقات فرشتے کسی کام کے نتیجے کی صحیح تصویر کھینچنے میں دیر لگاتے ہیں یعنی وہ

---

[1] بنی اسرائیل : ۱۳-۱۴

[2] یٰس : ۶۵

اس کی صورت نہیں بنا سکتے۔ اُس وقت اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جیسا کام ہے ویسا ہی لکھ لو۔ اس کے نتائج قلمبند کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔

امام غزالیؒ کا قول | حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں :-

اللہ تعالےٰ نے مخلوقات کے شروع سے لے کر آخر تک جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ سارے کا سارا ایک مخلوق چیز میں لکھ رکھا ہے اس مخلوق کو بھی اللہ تعالےٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔ اس مخلوق کو کبھی لوحِ محفوظ کہتے ہیں۔ کبھی کتابِ مبین اور کبھی امامِ مبین کہتے ہیں۔ یہ سب نام قرآنِ حکیم میں آچکے ہیں۔ اب یوں سمجھنا چاہیئے کہ اب تک جو واقعات ہو چکے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے، وہ سب کے سب اُس میں نقش ہیں۔ لیکن وہ نقش ایسا نہیں ہے کہ اُسے ہر شخص ان آنکھوں سے دیکھ سکے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ تختی لکڑی یا لوہے یا ہڈی کی ہے یا وہ کتاب کاغذ یا ورقوں کی بنی ہوئی ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ کی یہ تختی مخلوق کی کسی تختی کی سی نہیں ہے۔ اور نہ اس کی کتاب انسانوں کی کسی بنائی ہوئی کتاب کی طرح ہے جیسے اُس کی ذات اور صفات اس کی مخلوق میں سے کسی

ذات یا صفات سے نہیں ملتیں۔ اسی طرح اس کی یہ چیزیں عالم مخلوق کی چیزوں کی سی نہیں ہیں۔ لیکن ہم سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک مثال دیتے ہیں لوح محفوظ میں تمام دُنیا کی چیزوں اور مقداروں کا لکھا ہوا ہونا ویسا ہی ہے جیسے کسی حافظ کے دماغ میں قرآن کے حرف محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی اس کے دماغ میں لکھے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ حافظ جب پڑھتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے گویا اس لکھے ہوئے کو دیکھ رہا ہے۔ اگر حافظ کا دماغ چیر کر دیکھا جائے تو اس میں ایک حرف بھی لکھا ہوا نہیں ملے گا۔ اسی پر اللہ تعالے کی لوح (تختی) کو قیاس کرنا چاہیئے جس میں ہر وہ چیز جو ہونے والی ہے لکھی ہوئی ہے۔

نفس کے اندر کاموں کے اثرات محفوظ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے وہ اچھا ہو یا بُرا اور اس کے بدلے کی امید کرتا ہے تو اُسے یاد رکھتا ہے کہ اس نے یہ کام کیا، اور اس کام کا یہ بدلہ ملے گا۔ یہ بھی اس کام کا نتیجہ نفس کے اندر محفوظ ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

بارھواں باب (۱۲)

اعمال کا تعلق نفسی حالتوں کے ساتھ

بارھواں باب (۱۲)

اعمال کا تعلق نفسی حالتوں کے ساتھ

انسان کے اندر وہ چیز جو اپنی ہستی کو محسوس کرتی ہے اور کہتی ہے کہ "میں ہوں" وہی اُس کے سب ارادوں اور کاموں کا مرکز ہے۔ یہ اُس کی فطرت کا جزو ہے لیکن انسان کے اس نفس کو کسی اور چیز کے ذریعے سے معلوم کرنا مشکل ہے۔ وہ اپنے آپ کو چند کاموں کے ذریعے سے ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہ سارا نظام باقاعدہ ہے اس لئے ہمیشہ ایک خاص نفسی حالت خاص قسم کی حرکتوں

اور کاموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اب وہ کام اُن نفسی حالتوں کے گویا عُنوان بن گئے ہیں۔ چنانچہ جب انسان کی اِن چھُپی ہوئی نفسی حالتوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کاموں کی طرف اشارہ کرنا پڑے جو ان نفسی حالتوں کے اثر سے انسان کرتا ہے لیکن ان نفسی حالتوں کو کاموں سے الگ ضرور سمجھنا چاہیئے۔

جس طرح انسان کا نفس اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے ذریعے سے انسان سے کام کراتا ہے اُسی طرح وہ ان کاموں کے نتیجے (ملکات) بھی اپنے اندر محفوظ کرتا جاتا ہے۔ اس لیے اِن کاموں سے انسان کا نفس اثر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی خاص نفسی حالت کو جگانے کے لئے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو اس نفسی حالت سے پیدا ہوتے اگر وہ بیدار ہوتی۔ لیکن بعض لوگوں میں طبعی طور پر نفسی حالت اتنا احساس رکھتی ہے کہ وہ تھوڑے سے اثر سے بیدار ہو جاتی ہے ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو مشق اور لگاتار عمل کرنے ہی سے اپنے اندر وہ خُلق پیدا کر سکتے ہیں جو انسان کی روحانی حالت کے لئے مفید ہوں۔ شرعی قانون انہی

لوگوں کے لئے آتا ہے۔ گو یکسانیت کے لئے اُن لوگوں پر بھی لاگو ہوتا ہے جن کا "انا" (مَیں) بیدار ہو +

اِنسان جس طرح اپنے نفس کی اندرونی تحریک سے کام کرتا ہے۔ اُسی طرح وہ کبھی کبھی اُوپر کے فرشتوں کے اثر سے بھی کام کرتا ہے۔ لیکن یہ کام سوسائٹی کے خاص اجتماعی کام ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُوپر کے فرشتوں کا خاص تعلق انسانیت کے اجتماعی نظام سے ہے۔ عام طور پر بڑی تحریکیں اُوپر کے طبقے کے فرشتوں کے اثر ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو لوگ ان اجتماعی تحریکوں میں حصّہ لیتے ہیں اُن کی خاص طور پر مدد کی جاتی ہے +

عمل اور نفسی حالتیں | انسان کے کام اُس کی اندرونی نفسی حالتیں ظاہر کرتے ہیں اور یہی اُن نفسی کیفیتوں کی تشریح کرتے ہیں۔ نیز روحانی کیفیتوں کے شکار کرنے کا ذریعہ ہیں (یعنی عملوں ہی کے ذریعے روحانی حالتیں مضبوطی کے ساتھ انسانی نفس کے اندر جڑ پکڑتی ہیں) عام لوگ عمل اور نفسی حالت دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگ جب کبھی کسی روحانی کیفیّت کو بیان کرنا چاہتے ہیں، وہ اُس کے اظہار کے لئے عمل ہی کا ذکر کرتے ہیں جس کا تعلّق اُس نفسی کیفیّت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عمل اور نفسی حالت کا تعلّق اتنا

گہرا ہے کہ ساری نوعِ انسانی اسے محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ دُنیا کے ہر خطّے میں اور ہر ایک قوم میں نفسی کیفیتوں کو عملوں ہی کے ذریعے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور دونوں کو ایک ہی بتایا جاتا ہے۔ اس میں انسانیت کا کوئی طبقہ ایک دوسرے سے اختلاف نہیں رکھتا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز انسانی نوع کا فطری خاصہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسانی خیال ایک کام کرنے کی طرف متوجّہ ہو جاتا ہے اور انسان کی روحانی قوتیں اُس خیال کے پیچھے چلنے لگتی ہیں تو وہ خیال خوشی محسوس کرتا ہے۔ اور پھیل جاتا ہے۔ اور اگر روحانی قوتیں رُک جائیں اور اُس خیال سے مل کر کام نہ کریں تو وہ خیال کمزور ہو جاتا ہے۔ گویا انسان کی روحانی کیفیت کی مدد سے انسان کا عملی ارادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان جب وہ کام کر لیتا ہے تو اس خیال کا منبع (خواہ وہ ملکیت ہو یا بہیمیت) زیادہ قوت حاصل کر لیتا ہے اور اُس منبع کا مخالف منبع کمزور ہو جاتا ہے یعنی اگر اُس کام کے کرنے سے ملکیت کو قوّت پہنچتی ہے تو بہیمیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور اگر حیوانی قوّت کو زور حاصل ہو تو ملکیت کو صدمہ پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس میں تمنّا اور خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کے اعضا اُسے عمل میں لا کر اُس کی تصدیق کر دیتے ہیں یا اُسے عمل میں نہ لا کر اُسے جھٹلا

دیتے ہیں +

عمل اور اخلاق کا تلازم | ہم عام بول چال میں انسان کے اخلاق کے ظاہر کرنے کے لئے اس کے چند کاموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اخلاق کو اُن کاموں سے ظاہر کرتے ہیں اس طرح وہ عمل اور کام اُس خاص خلق کے پہچاننے اور ظاہر کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی انسان کی نسبت یہ کہنا چاہے کہ وہ بہادر ہے تو وہ بہادری کو یوں ظاہر کریگا کہ وہ شخص سختیاں سہ لیتا ہے اگر کسی کی سخاوت اور دریا دلی ظاہر کرنی ہو تو کہا جاتے گا کہ وہ یوں روپیہ خرچ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی انسان بہادری اور سخاوت کا تصوّر کرنا چاہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ ان کاموں کا تصوّر اپنے دل میں جمائے۔ ہاں کسی شخص نے اپنی فطرت ہی کو بگاڑ لیا ہو تو اَور بات ہے۔ وہ البتّہ اپنی روحانی حالتوں کو غلط کاموں کے ذریعے سے ظاہر کرے گا۔ لیکن یہ صورتیں کم پیش آتی ہیں۔ اس لئے قانون اِن پر توجہ نہیں کرے گا +

اب اگر کوئی شخص اپنے اندر کوئی ایسا خلق پیدا کرنا چاہے جو پہلے سے اُس کے اندر نہیں ہے تو اُس کے لئے یہی راستہ ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو وہ خُلق ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ کام خاص توجہ اَور کوشش کے ساتھ کرے، جو اس خلق کے متعلق ہیں۔

اور ویسے کام کرنے والے بڑے بڑے لوگوں کے کاموں کو یاد کرے۔ پھر عمل ہی ایسی چیز ہے جس کے کرنے کے لئے وقت مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ یہی نظر آنے والی باتیں ہیں۔ انہی پر غور ہو سکتا ہے۔ انہی کی پیروی کی جا سکتی ہے یہی وہ باتیں ہیں۔ جنھیں انسان اپنے اختیار اور ارادے سے کرتا ہے۔ اس لیے یہی ایک چیز ہے جس پر قانون کا نفاذ[۵] ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ قانون انعام دینے کے متعلق ہو یا سزا دینے کے متعلق ہو +

عمل اور ملکات کے لحاظ سے انسانوں میں فرق

لیکن تمام انسانی روحیں کاموں اور خُلقوں کے نتیجوں کو اپنے اندر لینے اور انہیں محفوظ رکھنے میں برابر نہیں ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عملوں کی بہ نسبت ملکات[۶] کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے انسان کا کمال ان ملکات کا اپنے اندر پیدا کرنا ہی ہوگا۔ اس سے اس کے کاموں کا حساب نہ

---

۵ نفاذ: قانون کا چلنا، اثر پڑنا۔ (مرتب)

۶ مَلَکہ: ایک کام بار بار کرنے سے ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان وہ کام بے تکلف کرنے لگتا ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ اس میں اس کام کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے اس بات کا اُس کام کی رُوح انسان کے نفس میں جذب ہو جاتی ہے پس ملکہ سے مراد اس کام کا جوہر یا نتیجہ ہے۔ (مرتّب)

لیا جائے گا۔ یعنی یہ نہ دیکھا جائیگا کہ اُس نے کام بھی کئے یا نہیں۔ بلکہ یہی دیکھ لیا جائے گا۔ کہ کاموں کے ذریعے سے جو ملکات پیدا ہونے چاہئیں وہ پیدا ہوگئے ہیں۔ لیکن چونکہ عملوں کو خُلقوں کے ساتھ خاص تعلق ہے اس لئے وہ ان خُلقوں کی موجودگی میں اُن کاموں کو بھی دیکھے گا جن کا تعلق ان خُلقوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ گو وہ عملوں کو کم اور اُن سے حاصل ہونے والے خلقوں کو زیادہ محفوظ رکھے گا۔ جیسے خواب میں معانی عملوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے ایک آدمی دیکھتا ہے کہ وہ لوگوں کے مُنہوں پر اور پوشیدہ اعضا پر مہریں لگا رہا ہے[۱]۔

بعض لوگوں کی روحیں کمزور ہوتی ہیں۔ ان کے کام ہی بڑی چیز شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ نفسی کیفیتوں کو مستقل طور پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ جب تک انہیں عملی صورت میں لا کر اپنے اندر جذب نہ کرلیں۔ انہیں نفسی حالتیں عملوں ہی کے اندر نظر آتی ہیں۔ اُنہی کے اندر ان عملوں کی "روحیں" جوہر جمع رہتی ہیں۔ انسانی سوسائٹی میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اُن کی خاطر قانون میں اس

---

[۱] جب یہ خواب خوابوں کی تعبیر کے ماہر امام ابن سیرین سے بیان کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ شاید تم رمضان میں سحری ختم ہونے سے پہلے اذان دے دیتے ہو گویا اس کے فعل کا معنی اور مطلب اس شکل میں دکھا یا گیا ہے۔

بات پر زور دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کام فلاں فلاں وقت کی پابندی کے ساتھ کیے جائیں۔ انہی کی خاطر مفصّل قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی قانون میں اخلاق کی بہ نسبت عملوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

ہمارے عملوں پر ملاء اعلیٰ کا اثر ایک خاص قسم کے اعمال وہ ہیں جو اُن روحانی حالتوں کے محتاج نہیں ہوتے جن سے وہ عام طور پر ظاہر یا صادر ہوتے ہیں۔ وہ سیدھے ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی اچھائی بُرائی کا سیدھا تعلّق ملاء اعلیٰ ہی سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کے کام کرنے لگ جائے تو گویا وہ ملاء اعلیٰ کا الہام لے لیتا ہے۔ اور اس سے وہ ان کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی سی حالت پیدا کر لیتا ہے اور ان کے نور کی کرنیں سیدھی اُس کے دل پر پڑنے لگتی ہیں۔ یہ سب کچھ ملاء اعلیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور اُس کام کی برکت سے ہوتا ہے جس کے کرنے کا فیصلہ ملاء اعلیٰ میں ہو چکا ہوتا ہے۔ اس میں اُس شخص کی رُوحانی کیفیت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ملاء اعلیٰ کی طرف سے ان کاموں پر اظہار نفرت ہوتا ہے جنھیں وہاں بُرا سمجھا جاتا ہے۔

اس کے اسباب ملاء اعلیٰ کو ان خاص کاموں سے جو خاص محبت پیدا ہو جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں:۔

(۱) اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات آتی ہے۔ کہ انسانی نوع کا نظام فلاں کاموں کے کرنے اور فلاں سے بچنے سے اچھا ہو سکتا ہے (چونکہ اُنہیں انسانی نظام کی طرف توجّہ زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس نظام کو اچھا بنانے والے کاموں سے انہیں خاص محبّت ہو جاتی ہے) پھر وہ کام ملاء اعلیٰ میں خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہیں سے نبیوں کی شریعتوں کا جزو بن کر نازل ہوتے ہیں۔

(۲) انسانوں میں سے ایسے انسانوں کی رُوحیں جو یہ کام ہمیشہ کرتے رہے ہیں جب ملاء اعلیٰ میں پہنچ جاتی ہیں، تو ان انسانوں کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ان عملوں کی طرف متوجہ ہونے لگتی ہے اور جب اس طرح لمبا زمانہ گزر جاتا ہے تو اس قسم کے عملوں کی صورتیں اُن کے نزدیک مستقل طور پر توجّہ کے قابل بن جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس دُوسری حالت میں عملوں کی تاثیر ایسی ہوتی ہے جیسے جنتر منتر اور تعویذ کی تاثیر جو بزرگوں سے چلے آتے ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تیرھواں باب (۱۳)

کرموں کا پھل کیوں ملتا ہے؟

تیرھواں باب (۱۳)

کرموں کا پھل کیوں ملتا ہے؟

یہ بات ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیئے کہ انسان کے عملوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اس میں ایک درجہ علت بن جاتا ہے۔ تو اس سے دوسرا درجہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر دوسرا درجہ تیسرے درجے کے پیدا ہونے کا سبب یا علت بن جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ ہر ایک درجے میں علت سے اس کا معلول پیدا ہونا لازم اور ضروری ہے۔ اسی کو اس کام کی جزا یا سزا کہا جاتا ہے۔

انسانی کام اُس کے وجود کے نظام سے کچھ اس طرح صادر ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اُن کاموں کا مُوجد یا پیدا کرنے والا سمجھتا ہے۔ حالانکہ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے اسباب اکٹھے ہوتے ہیں تو کہیں وہ کام وجود میں آتا ہے۔ لیکن اُس کام کے ظاہر ہونے کا سب سے قریبی سبب انسان کا ارادہ ہوتا ہے۔ انسان اُن دُور کے سببوں کو تو بھُول جاتا ہے لیکن قریبی سبب یعنی اپنے ارادے کو یاد رکھتا ہے۔ مثلاً ایک انجن ہے اس میں بہت سے پُرزے کام کرتے ہیں۔ ہر ایک پُرزے کے حرکت کرنے کے ایک تو قریبی اسباب ہیں اور ایک دُور کے اسباب۔ قریبی سبب تو وہ پُرزے ہیں جو اُس پُرزے سے جُڑے ہوتے ہیں۔ لیکن سب سے دُور کا سبب ڈرائیور ہے۔ لیکن ڈرائیور اپنے ہاتھ سے دستہ گھمانے کو انجن کے چلنے کا سبب سمجھتا ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک ہاتھ کا ہلانا سب سے قریبی سبب ہے۔ ایسے ہی انسان کے اپنے سب کل پرزے مل کر اور اُن پرزوں کی مدد کرنے والی باہر کی طاقتوں کے ملنے سے ایک کام پیدا ہوتا ہے لیکن انسان کا ارادہ اس مجموعے سے آخری ٹکڑے کے طور پر آ کر لگتا ہے

تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان اُسے فقط اپنے ارادے یا اپنی ہی قوتوں کی پیداوار سمجھتا ہے +

اب اس عمل کو ایک مستقل علّت بنا دیجئے۔ اس علّت سے ایک اور نتیجہ پیدا ہوا۔ پھر اس نتیجے کو ایک مستقل علّت مانئے، تو اُس سے ایک اور نتیجہ پیدا ہوا۔ اسی طرح نتیجے کے نتیجے لگاتار پیدا ہوتے رہیں گے اور کبھی ختم نہ ہوں گے۔ انسانی ذہنیت مجبور ہے کہ جس نتیجے سے اُسے سیدھا واسطہ پڑے اُس کی نسبت یہ سمجھے کہ یہ میری کمائی ہے۔ اور یہ کام میں نے کیا ہے۔ اور اس کا بدلہ مجھے ملنا چاہیئے +

ایک اور مثال لیجئے۔ انسان نکاح کرتا ہے۔ اس کے بعد قدرتی قوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں بچّہ پیدا کرنے میں انسان کا اپنا بہت تھوڑا حصّہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنی ذہنیت سے یہی سمجھتا ہے کہ یہ میرا اپنا ہی حصّہ ہے۔ یعنی بچّہ مَیں نے ہی پیدا کیا ہے۔ یہ اسی ذہنیّت کا نتیجہ ہے کہ بچّے کی تربیت کرتا ہے۔ یعنی اُس کی ضرورتیں بہم پہنچانے کے لیے انسان طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقّتیں خوشی خوشی سہتا ہے۔ اور بچّے سے آگے جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں اُنہیں اپنے عمل کا بدلہ سمجھتا

ہے۔ اور اُن پر کسی نہ کسی طریق سے اپنا ملکیّت کا حق ثابت کرتا ہے۔ مثلاً اُس کی کمائی کو اپنا حق بناتا ہے۔ اب اگر ان سب علتوں کی تحقیق کی جائے جن سے بچّہ پیدا ہوا ہے تو معلوم ہوگا۔ کہ ماں باپ کا اُس کی پیدائش میں اتنا کم دخل ہے کہ اُن کا اُس پر قبضے کا حق پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی دماغ پر انسانی نوع کی مصلحتیں اثر ڈالتی ہیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یقین کرنے لگتا ہے کہ یہ میرے عمل کی پیداوار ہے۔ اور مَیں ہی اس کے نتیجوں کا حقدار ہوں اگر بچّے کی پیدائش کے اصلی اسباب کا کھوج نکال کر انسانوں میں پراپیگنڈہ کیا جائے کہ وہ اپنی اولاد پر اپنا حق نہ جتلانے لگیں تو اس کا نتیجہ صفر ہی نکلے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچّے کی پرورش کے لئے نوعِ انسانی کی ضرورتوں کا تقاضا ہے کہ ماں باپ کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اُسے اپنا سمجھیں اور اُس کی پرورش کریں۔ کیونکہ انسان کا بچّہ دُوسرے حیوانوں کے بچوں کی طرح پرورش نہیں پا سکتا لیکن اس مصیبتناک خدمت کو انسان خوشی سے اُس وقت ہی اپنے سر لے سکتا ہے جب وہ اُس چیز (بچّے) کو اپنا سمجھے۔ اس عمومی حکمت نے انسانی دماغ پر یہ اثر ڈال

رکھا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو " اپنی " سمجھتا ہے اور اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ اس لئے شوق سے اس کی پرورش کرتا ہے +

انسان کی چھوٹی سی ہستی سے اللہ تعالےٰ کی حکمت جو کام لینا چاہتی ہے وہ انسان کے وجود کے مقابلے میں بہت مشکل ہے۔ اور ان مشکلوں کے لئے انسان کبھی قربانی نہیں کر سکتا۔ جب تک اُس کے ذہن میں یہ بات نہ ڈال دی جائے۔ کہ وہ اپنے عمل کو خود پیدا کرتا ہے گو پوری اور اصل حقیقت ایسی نہیں ہے۔ اسی طرح انسان اپنے عملوں کا خالق نہیں ہے یعنی وہ اپنے اعمال آزادی کے ساتھ خود اپنے طور پر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے عملوں کو وجود میں لانے والی مشینری چلانے کے لئے خدا جانے کتنے اسباب کام کرتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ کام پُورا ہوتا ہے۔ انجن کے ڈرائیور کی طرح (جو پرزوں کو ادھر اُدھر پھرانے میں کام کرتا ہے) انسان کا ارادہ بھی کچھ عمل کرتا ہے اس لئے انسان کو حق دے دیا گیا ہے کہ وہ اس کام کو اپنا کام سمجھے اور اپنا پیدا کیا ہوا خیال کرے۔ چنانچہ وہ اُسے پورا کرنے کے لیے اپنی پوری قوت اور طاقت خرچ کر دیتا ہے۔

جب کام کرتے کرتے قتل ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو شہید سمجھتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔ یہ انسان کے نوعی نظام کے چلانے کے لئے ضروری ہے۔ اب اس سے جو نتیجے پیدا ہونگے ان پر انسان اپنا حق جتاتا ہے اسے "جزاء" کہا جاتا ہے۔

جب کبھی ساری نوع انسانی کا آمد و خرچ کا حساب کیا جائیگا۔ یعنی اس نے مجموعی طور پر کیا نتیجے پیدا کئے اور کس قدر قوت نے پیدا کئے؟ اس کا مفید اثر عام کائنات پر کیا پڑا؟ جب اس کا حساب کیا جائے گا تو یہی کہا جائے گا کہ نوع انسانی نے مل کر ایک کام کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا اگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوع انسانی نے ترقی کی ہے تو ساری کائنات کی زبان سے اس کی تعریف نکلے گی۔ اگر مجموعی طور پر نوع انسانی کو نقصان پہنچا تو عام کائنات اپنے آپ کو بری قرار دے کر نوع انسانی کو اس کا ذمہ دار قرار دے گی کہ اس نے خود یہ کام کیا اِس لیے نقصان اٹھایا۔ اگر نوعِ انسانی کا علیحدہ وجود مانا جائے اور وہ باقی کائنات کے مقابلے میں اپنی علیحدہ ہستی پر بحث کر سکے تو انسانی ذہنیت کو جو آج پائی

جاتی ہے، عام انسانی فطرت کے مطابق ماننا پڑے گا۔ اگر انسانی نوع کو عام کائنات میں اس طرح گم کر دیا جائے کہ یہ اُس بڑی مشین کا ایک خادم پُرزہ ہے، تو انسان اپنی علیحدہ ہستی فرض نہیں کر سکتا۔ اس نظریّے کے مطابق یہ بات ٹھیک نہیں بیٹھتی کہ انسان اپنے عمل خود پیدا کرتا ہے۔ اِس لئے اُسے اُن کے نتیجے جزا کے طور پر ملتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسانی نوع کل کائنات کا ایک جُز ہے پھر بھی اُسے ایک قسم کا مستقل وجود حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ ذہنیت اسی بات پر موقوف ہے اور انبیاء اسی کی تعلیم دینے آئے ہیں +

انبیاء کے مقابل میں طبیعات (Physics) کے عالم ہیں جو انسانی ہستی کو ایک بڑی مادی مشین کا ایک معمولی پرزہ سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں کہ انسان کی جُداگانہ ہستی ہے۔ اور وہ اپنے عملوں کا مالک ہے انسان جو کام کرتا ہے وہ اسے تمام مادے کی قوتوں کے نام لگا دیتے ہیں۔ لیکن اس تمام مشین میں سے جو حصّہ ہمیشہ انسانی نوع سے پیدا ہوتا رہتا ہے اُس کا حساب یعنی حق تنہا

انسانی نوع کو دینے کو راضی نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ مادے میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اُن میں ایک کڑی انسان کی بھی پڑتی ہے۔ وہ اس کڑی کو مستقل نظر سے نہیں دیکھتے اُن کے سامنے جو چند دن کی مادی زندگی ہے یہی انسان کے لئے دل خوش کرنے کا سامان رکھتی ہے۔ اس دُنیاوی زندگی میں وہ ایک علیحدہ اجتماعی حالت پیدا کر لیتا ہے۔ اور کائنات کے دوسرے اسباب سے مقابلہ کرتا ہے کہیں اُنہیں اپنے ماتحت کر لیتا ہے کہیں شکست کھاجاتا ہے۔ اِس وقت اس کی فتح و شکست کے مسئلے پر غور نہیں ہو رہا۔ فقط یہ دیکھنا ہے کہ وہ اس دنیاوی زندگی میں ایک استقلال پیدا کر لیتا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو کائنات کے اسباب کے ماتحت مجبور اور کمزور سمجھنے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ شکست کھانے کے بعد بھی فتح حاصل کرنے اور اُن اسباب کو اپنے قابو میں لانے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔

اس کے بعد اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ انسانی دماغ میں جو کیفیّت پیدا ہوئی کیا یہ اس مادی سلسلے کی ایک عارضی نمائش ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستقل سمجھتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ مستقل ہستی نہیں رکھتا؟ یا جن مادی قوتوں

نے اس کے پیدا کرنے میں حصّہ لیا ہے اُن کا طبعی تقاضا تھا کہ یہ اپنے آپ کو مستقل ہستی سمجھے؟ اگر یہ دوسرا خیال صحیح مان لیا جائے تو انبیاء کے تابع حکماء اور مادّے پر غور کرنے والے اعلیٰ عقلمندوں کے درمیان اس بارے میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ فقط لفظی اختلاف ہوگا۔ اصل میں اُن کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے +

ہم نے اس جگہ اس مسئلے کا ابتدائی حصّہ بیان کیا ہے شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عبقات میں اسے پورے طور پر سمجھا دیا گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم بھی ضرورت کے مطابق ترجمے میں اُس کا ذکر کرتے رہیں گے +

انسانی زندگی کے لمبے سلسلے میں انسان کو جس قدر جزاؤں (عملوں کے نتیجوں) سے واسطہ پڑتا ہے وہ اگرچہ اَنگنت ہیں۔ لیکن انہیں دو قاعدوں میں لایا جا سکتا ہے :-

(۱) انسانی نفس کا فیصلہ | انسانی نفس کی مَلَکی قوّتیں (مثلاً عقل) فیصلہ کرتی ہیں کہ فلاں کام جو بڑی محنت سے کیا گیا ہے یا فلاں خُلق جو بڑی مشقّت سے حاصل کیا گیا ہے۔ ہمارے خلاف ہے۔ اُن کا یہ فیصلہ انسان کے اندر حسرت اور افسوس پیدا کر دیتا ہے اور درد کی شکل میں محسوس ہونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اس فیصلے میں زیادہ قوّت

ہوتی ہے تو اُسے خواب میں بھی ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں۔ جن سے اسے درد پہنچتا ہے یا وہ توہین اور بے عزّتی محسوس کرتا ہے یا اُسے دھکی ملتی ہے۔ کبھی یہ احساس اتنا زوردار ہوتا ہے کہ ایسی ہی باتیں جاگتے میں دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی انسان کی ملکی قوّت اتنی تیز ہوتی ہے کہ اُس کی طاقت کے مطابق اسے مخالفت کا الہام ہوتا ہے۔ اس حالت میں اُسے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں وہ اُن سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے اُسے غلطی پر خبردار کر دیا جاتا ہے اس الہام میں کوئی انوکھا قاعدہ نہیں برتا جاتا بلکہ یہ انسان کا طبعی تقاضا ہے کہ جب ایک کام اُس کے لئے ضروری ہو تو اُسے فرشتوں کے ذریعے سے علم دیا جائے۔ بشرطیکہ اُس کی ملکی قوّت اُن سے یہ علم لے سکتی ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اس آیت میں بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (ہاں جو لوگ بُرا کام کریں اور خطا انہیں ہر طرف سے گھیر لے تو وہ لوگ دوزخ میں جائیں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے[1]) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) ملاء اعلیٰ کی توجّہ | اونچے درجے کے فرشتوں (ملاء اعلیٰ) کے پاس انسانی

---

[1] سورۃ بقرہ: ۸۱

نفس کی اچھّی اور بُری حالتوں اور اچھّے اور بُرے عملوں اور خُلقوں کا مجموعہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ وہ فرشتے اپنی پوری طاقت اور ہمّت کے ساتھ دُعا کرتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں لوگوں کو (جنھوں نے اچھّے کام کئے ہیں) نعمت اور کامیابی دی جاتے۔ اور فلاں فلاں لوگوں کو (جنھوں نے بُرے کام کئے ہیں) عذاب دیا جائے۔ چنانچہ اُن کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں تو انسانوں کی ان جماعتوں پر ان فرشتوں کی ہمتوں کا اثر پڑتا ہے۔ اور جس طرح اِن فرشتوں کے ذریعے سے اللہ تعالےٰ کی طرف سے انسانوں کی ضرورت کے مطابق علم نازل ہوتا ہے اسی طرح ان فرشتوں کی دُعاؤں کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کی طرف سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی نازل ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس جماعت میں تکلیف دینے والے یا راحت پہنچانے والے واقعات پیش آنے لگتے ہیں۔ اب فرشتے اُنہیں دھمکاتے نظر آتے ہیں یا وہ اُن میں خوشی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسانی نفس ملاء اعلیٰ کے اثر سے اللہ تعالےٰ کی ناراضگی کو شدّت سے محسوس کرتا ہے تو اس پر غشی چھا جاتی ہے یا بیماری کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان اُونچے درجے کے فرشتوں کا قطعی فیصلہ تھوڑا تھوڑا کر کے اترتا ہے۔ اور طبیعت کے کمزور پہلو مثلاً خواطر (دلی خیالات) اُن سے اثر لیتے ہیں چنانچہ نچلے درجے کے فرشتوں یا انسانوں کے دلوں میں خود بخود یہ خیالات آنے لگتے ہیں کہ فلاں

شخص کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور فلاں کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

فرشتوں کا مقام نظامِ عالم میں | کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے واقعے پیش آتے ہیں جن سے کسی شخص کو آرام یا دکھ پہنچانا ہوتا ہے صاف صاف بات تو یہ ہے کہ نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے۔ جو اُس وقت سے ہے جب اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اُس مہربانی کا لازم نتیجہ ہے کہ انسانوں کو یونہی نہ چھوڑ دیا جائے اور جو کام وہ کریں اُس کے متعلق اُن سے پوچھا جائے کہ یہ برا کام کیوں کیا اور جو اچھا کام کریں اُس کا اُنہیں اچھا بدلہ دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالےٰ یہ کس طرح کرتا ہے؟ اس کی اصل حقیقت سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے یہ مسئلہ فرشتوں کے واسطے سے حل کیا ہے۔ یعنی ہم نے اسے یوں ظاہر کیا کہ اچھا کام کرنے والوں کو فرشتوں کی اچھی دعاؤں سے آرام پہنچتا ہے اور برے کام کرنے والوں کو فرشتوں کی بددعاؤں سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اور یہ ہم نے قرآنِ حکیم کی اس آیت سے لیا ہے:۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰئِكَ عَلَیْھِمْ لَعْنَةُ اللّٰہِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ، خَالِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ (یعنی جن لوگوں نے قرآن حکیم کی تعلیم ماننے سے انکار کر دیا اور اس انکار اور کفر کی ہی حالت میں مر گئے۔ اُن پر اللہ تعالےٰ

کی لعنت، فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت رہے گی۔ اور وہ اُس حالت میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ تو اُن کا عذاب ہلکا ہوگا اور نہ اُنہیں مہلت دیجائیگی)[۵۱]

ان دونوں قاعدوں کی جمع ان دونوں قاعدوں کے ملانے سے انسانی نفس کی استعداد اور کرموں کے مطابق بہت سی عجیب عجیب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلے قاعدے کے مطابق نفس انسانی پر اُس کی ملکیّت کا اثر اُن عملوں اور خُلقوں پر زیادہ اثر رکھتا ہے جو انسان کے نفس کو درست یا خراب کرتے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ اثر وہ نفس قبول کرتے ہیں جن میں ملکیت زیادہ صاف اور زوردار ہو۔ دوسرے قاعدے میں اُونچے درجے کے فرشتوں کا اثر اُن عملوں اور خُلقوں پر زیادہ پڑتا ہے جن کا تعلق سارے اجتماع انسانی سے ہو یا انسانی نظام کے مجموعے سے ہو۔ مثلاً انسانی نوع کے فائدے کے خلاف ہو یا انسانی نظام کو خراب کرنے والا ہو۔ اُس کا اثر وہ نفس زیادہ قبول کرتے ہیں جو ملکیّت میں کمزور اور نکمّے ہوں +

ان دونوں قاعدوں کے اثر کو روکنے والی چیزیں ان دونوں سببوں، یعنی انسان کی ذاتی ملکیّت اور اُونچے درجے کے فرشتوں کے اثر کے ظاہر ہونے میں بعض چیزیں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس لئے ان کا

---

[۵۱] سورہ بقرہ: ۱۶۱

اثر ایک وقت تک ظاہر نہیں ہوتا۔ پہلے قاعدے کے اثر کو لینے والی چیز انسان کی ملکیت کی کمزوری اور بہیمیت کا زور والا ہونا ہے کبھی بہیمیت اتنے زور کی ہو جاتی ہے کہ انسان نرا ڈنگر بن جاتا ہے اُس حالت میں وہ اُن تکلیفوں کو محسوس نہیں کرتا جو ملکیت کے خلاف کام کرنے سے ہوتی ہیں۔ جب انسان حیوانیت کے غلاف میں سے نکل آئے گا اور اُس کے اردگرد کے حالات سے اُس کی حیوانیت کو جو مدد پہنچتی ہے۔ وہ گھٹ جائے گی اور ملکیّت کے چمتکار ظاہر ہوں گے تو آہستہ آہستہ عذاب یا آرام پائے گا +

مثلاً ایک شخص نوجوانی کے عالم میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اُس کی بُڑھیا ماں کوئی حکم دیتی ہے جس میں زیادہ تر اُس نوجوان ہی کا فائدہ ہے۔ لیکن وہ نوجوان جوانی کے جوش میں ماں کے حکم کی پروا نہیں کرتا۔ اب اُس کی ماں مر جاتی ہے اور وہ شخص خود بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے بچّے جوانی کو پہنچتے ہیں۔ اُس کے نوجوان بچّے اب اُس کی اُسی طرح نافرمانی کرتے ہیں جس طرح وہ کبھی اپنی بُڑھیا ماں کی نافرمانی کیا کرتا تھا۔ اِس سے اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ اور اُس کے دماغ پر ایسی حسرت اور شرمندگی چھا جاتی ہے۔ کہ وہ اُس کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ اب وہ اپنی ماں کے حکموں کی حکمت کو سمجھتا ہے۔ اس قسم کے تجربے

انسانی زندگی میں بہت دفعہ پیش آتے رہتے ہیں +]

دوسرے قاعدے کو روکنے والی ایک چیز ہے اور وُہ یہ کہ ایسے قدرتی اسباب جمع ہو جائیں جو اس کے خلاف ہوں۔ اُس وقت ان قدرتی اسباب کا حکم چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جو اللہ تعالے نے اُن فرشتوں کے فیصلے کے چلنے کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ یعنی قدرتی اسباب اپنا کام کر چکتے ہیں اور اُن کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس وقت انسان کے کاموں کا نتیجہ جو جمع ہو رہا تھا۔ یکلخت زور سے برس پڑتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا: لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (یعنی ہر ایک قوم (کے گرنے) کا ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو جزا مل کر رہتی ہے۔ اُس وقت وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتی ہے نہ ایک گھڑی آگے +)[1]

---

[1] سورۂ اعراف: ۳۴

دوسرا مبحث

انسان کے عملوں کی جزا
اس زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں

[پہلے مبحث میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے اس کا نتیجہ نکلنا ضروری ہے۔ اس مبحث میں دکھایا جائے گا کہ وہ نتیجہ کن اصول کے مطابق نکلتا ہے۔]

چودھواں باب (۱۴)

دنیا میں انسان کے عملوں کی جزا

چودھواں باب (۱۴)

دُنیا میں اِنسان کے عملوں کی جزا

اِنسان کی نظر جتنی کائنات پر زیادہ پڑتی جاتی ہے، وہ اپنی حقیقت پر اُسی کے مطابق غور کرتا رہتا ہے۔ پہلے اُس کی نگاہ تھوڑی سی کائنات پر پڑتی تھی تو وہ اپنی ذات کے متعلق اُتنے ہی تھوڑے سے علم سے سوچتا تھا۔ پھر اُس کی معلومات کا دائرہ زیادہ چوڑا ہوا تو اس نے زیادہ تجربے اور علم کے ساتھ اپنے متعلق سوچنا شروع کیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس ترقی کے ہر دَور میں انسان اپنے اندر اُن سب قوتوں کے نمونے پاتا ہے

جنہیں اُس نے اپنے سے باہر کی دُنیا میں پالیا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان اس لمبی چوڑی کائنات (Macrocosm) کا ایک چھوٹا سا نمونہ (Microcosm) ہے +

اس دُنیا میں طرح طرح کے اسباب کی تاثیر سے طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے کبھی زمین کے کسی حصّے میں پانی نہیں برستا تو کال پڑ جاتا ہے۔ اور نباتات، حیوانات اور انسان سب کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے موسم میں ضرورت کے مطابق مینہ پڑتا ہے تو ہر قسم کی مخلوقات کو بڑھنے کے لئے جس جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ مل جاتا ہے۔ انسان ٹوہ لگانے لگے تو کال اور سیرابی کے اسباب ایک حد تک جان لیتا ہے۔ گو ایک شخص ایک راستے سے چلے اور دوسرا دوسرے راستے سے مگر دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسی طرح ایک انسان کے لئے ایک سمے میں خوشی کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے وقت میں تکلیفیں اور مصیبتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اگر انسان اپنی اندرونی بناوٹ کو اچھّی طرح جانتا ہو تو وہ ٹھیک ٹھیک طور پر اس دُکھ اور سُکھ کو سمجھ سکتا ہے۔ یہاں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک سمت سے چلے اور دوسرا دوسری سمت سے، لیکن وہ دونوں

ایک ہی جگہ پہنچ جاتیں - ان باتوں کو ایک خاص نظریہ رکھنے والی جماعت کے طریق پر صحیح طور پر جان لینا اس دُنیا میں انسان کے عملوں کی جزا معیّن کر لینا ہے۔ اس مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس کی ملکیت اور بہیمیت کی لڑائی کا نتیجہ ہے۔ ملکیت اور بہیمیّت سے آگے جو اسباب ہیں۔ اُن پر یہاں بحث نہیں ہے۔ ان کا ذکر مصنّف نے اپنی دوسری کتابوں میں کیا ہے۔ ملکیت اور بہیمیت کی جنگ کے نظریے کے مطابق دُنیاوی تکلیفوں کے جو ایک انسان یا انسانوں کی ایک جماعت کو پہنچتی ہیں، اسباب معیّن کرنا اس بحث کا خلاصہ ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ (یعنی جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سی مصیبتیں معاف کر دیتا ہے[1]) نیز لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (یعنی اگر یہ لوگ تورات انجیل اور ان حکموں کو اُن کے ... کی

---

[1] سورہ شوریٰ : ۳۰

طرف سے اترے، قائم کرتے تو وہ بے تکلیف اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے)[۵۱]

(یعنی جس چیز کو کوئی قوم اپنی ذہنیت کے مطابق خدا کا حکم مان لے اگر وہ اُسے نیک نیتی سے کام میں لاتی رہے تو دُنیا کی سب چیزیں اُسے کام دینے لگتی ہیں وہ جس چیز سے فائدہ اُٹھانا چاہے اُٹھا سکتی ہے۔ جب وہ اس سچی تعلیم سے بے پرواہی برتنے لگ جاتی ہے تو اُس کی زندگی کا نظام بگڑ جاتا ہے)

قرآن حکیم کی سورت نوٗن میں خدا تعالیٰ ایک تمثیل میں فرماتا ہے۔ کہ جب باغ کے مالکوں نے صدقہ دینے کا ارادہ بدل لیا تو اتفاق سے باغ کو آگ لگ گئی۔

قرآن حکیم کی اس آیت کی تفسیر میں کہ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (اگر جو کچھ تمہارے دل میں ہے اُسے ظاہر کرو یا چھپائے رکھو اللہ تعالیٰ تم سے سب کا حساب لے گا)[۵۲] اور اس آیت کی تفسیر میں کہ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءًا یُّجْزَ بِہٖ (جو کوئی بھی کوئی سا بُرا کام کریگا اس کا بدلہ اُسے ضرور دیا جائے گا)[۵۳] رسول کریم صلعم

---

[۵۱] سورہ مائدہ : ۶۶

[۵۲] سورہ بقرہ : ۲۸۴

[۵۳] سورہ نساء : ۱۲۳

فرماتے ہیں کہ اس حساب کے نتیجے کے طور پر اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو جو عذاب دیتا ہے اس میں بخار اور چھوٹی چھوٹی تکلیفیں بھی شامل ہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول گیا۔ پھر اس کی تلاش میں پریشان ہوا تو یہ پریشانی بھی اسی حساب میں گنی جائے گی گویا اُسے ایک طرح کا عذاب دے دیا گیا اس طرح بندہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے سونا کٹھالی سے نکالتے وقت صاف ہوتا ہے۔

ملکیت اور حیوانیت کا تعلق | واضح رہے کہ انسان کی ملکیت (عقلیت) اُس کی حیوانیت میں چھپنے کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ مل جانے کے بعد الگ ہوتی ہے۔ ملکیت کا یہ ظہور اور علیحدگی کبھی تو طبعی موت سے شروع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد بہیمیت یا حیوانیت کو غذا سے مدد نہیں ملتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اُس کی سب قوتیں گھل جاتی ہیں اور انسان کے نفس میں ملکیت کا جو حصّہ ہے وہ پریشان کرنے والی حالتوں سے بچا رہتا ہے اُسے بھوک، سیری اور غضب سے کوئی علاقہ (تعلق) نہیں رہتا۔ اس وقت اُس پر عالمِ قدس (ملکیت کی دُنیا) سے رنگ آنے لگتا ہے۔ یعنی انسان کی ملکیت بیدار ہو جاتی ہے اور بہیمیت کے ساتھ مل کر کام کرنے سے اُسے جو زخم پہنچے تھے ان کی تکلیف محسوس ہونے

سکتی ہے ۔

اسی طرح انسان اختیاری موت کے ذریعے سے بھی اپنی ملکیت تو اس دنیا ہی میں بیدار کر سکتا ہے۔ چنانچہ کم کھانے کم سونے اور کم بولنے کی ریاضتیں اور مشقیں کرتا رہے اور ملکیت کے منبع (عالم قدس) کی طرف ہمیشہ دھیان لگائے رکھے تو بھی اس پر ملکیت کی چند شعاعیں چمکنے لگتی ہیں۔ یعنی مرنے کے بعد جو باتیں ملکیت کے ظاہر ہونے سے معلوم ہوں گی۔ وہ اب اِس زندگی ہی میں معلوم ہونے لگتی ہیں ۔

ایک قاعدہ: اجمالاً یہ بات ایک قاعدے کی شکل میں یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ جس طرح کسی چیز کے مناسب حال کام کیے جائیں یا حالتیں پیدا کی جائیں تو اُسے خوشی محسوس ہوتی ہے اور اگر اس کے خلاف باتیں پیدا کی جائیں تو ایک قسم کا گھٹاؤ اور درد پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان جو کام ایسے کرتا ہے جو ملکیت کے موافق ہوں اُن سے تو ملکیت کو خوشی اور پھیلاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اور جو کام وہ اُس کے خلاف کرتا ہے اُس سے ایک قسم کا گھٹاؤ اور درد محسوس ہوتا ہے

دوسرا قاعدہ: ایسے ہی یہ قاعدہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک درد اور تکلیف کے لیے ایک خاص شکل ہوتی ہے جس میں وہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی مثال طب سے اچھی مل سکتی ہے۔ چنانچہ انسان کے

بدن میں چار خلطیں (HUMOURS) موجود ہیں یعنی صفرا۔ سودا۔ بلغم اور خون۔ ان میں سے کوئی خلط انسان کے مزاج پر غالب آجائے تو اپنا خاص اثر دکھاتی ہے۔ مثلاً اگر سودا غالب آجائے تو انسان ایک قسم کی خستگی (بدن کا ٹوٹنا) محسوس کرتا ہے۔ اگر صفرا غالب آجائے تو بے چینی محسوس ہونے لگتی ہے۔ انسان خواب میں آگ کے شعلے دیکھتا ہے اور بلغم کے غلبے سے سردی کی شکل میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اور انسان خواب میں پانی اور برف دیکھتا ہے۔ ایسے ہی جب ملکیت ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ انسان کے حواس میں خاص خاص شکلیں اور صورتیں پیدا کرتی ہے۔ اگر انسان اپنے اندر اعلےٰ درجے کی پاکیزگی (نظافت) اور اللہ تعالےٰ کے آگے عاجزی (خضوع) اور اسی قسم کی دوسری ذہنی کیفیتیں جو ملکیت کے مناسب ہیں پیدا کرے، تو بیداری یا خواب میں اُنس اور خوشی کی خاص شکلیں اختیار کر کے اُسے دکھائی دیتی ہیں اور اگر اُس نے ملکیت، پاکیزگی اور اللہ کے آگے عاجزی کے خلاف عادتیں پیدا کر لی ہیں۔ تو وہی عادتیں اعتدال سے ہٹی ہوئی کیفیتوں کی شکل میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اور ایسے خواب آنے لگتے ہیں جن سے بے عزتی اور دھمکی محسوس ہوتی ہے۔ ملکیت کے غالب آنے

اور انسانی مزاج پر کسی خلط (HUMOUR) مثلاً صفرا، وغیرہ کے غلبے کو ملا کر دیکھنے سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ ملکیت کا ظہور اور غلبہ انسان کے ذہن میں وہ حالت اور کیفیت کیوں وہ شکل پیدا کر دیتا ہے جو وہ کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح کسی خلط کے غلبے سے اس کے مناسب خواب آتے ہیں بلکہ زیادہ غلبے کی حالت میں بدن پر بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے جیسے صفرا کے غلبے کے وقت آنکھوں میں زردی آجاتی ہے اور ہر چیز زرد دکھائی دیتی ہے ویسے ہی ذہنی کیفیت کا حال ہے۔ چنانچہ جب ملکیت غالب آجاتی ہے انسان کے اندر غضب کا جذبہ درندے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ جو کاٹ رہا ہو اور بخل سانپ کی شکل میں نظر آتا ہے جو ڈس رہا ہو۔

عملوں کی جزا کا قاعدہ | یہاں یہ بات بھی قاعدے کے طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ دُنیا میں انسان کو جو جزا ملتی ہے وہ اس دُنیا میں کام کرنے والے اسباب کے نیچے ملتی ہے۔ یعنی اگر قدرت کے کارخانے میں کام کرنے والے قاعدے اور قانون اُس سزا کے اسباب پیدا کر سکتے ہیں تو وہ سزا یا جزا مل رہتی ہے نہیں تو ملتوی رہتی ہے۔ جو شخص ان قاعدوں اور قانونوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور کائنات میں کام کرنے والے کارکنوں (اسباب) کا جو سلسلہ جاری ہے اُسے اچھی

طرح پہچان لے وہ اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قانون الٰہی کے توڑنے والے کو دنیا ہی میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اس جزا یا سزا میں جو کمی ہوتی ہے یا جزا کبھی نہیں ملتی تو وہ اسباب (کائنات) کے اس سلسلے کی وجہ سے ہوتی ہے جس کے ماتحت (نیچے) دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے تو اب یوں ہو گا۔ کہ اگر کسی انسان نے اچھے کرم کیے اور اُن کے بدلے میں اُسے انعام ملنا چاہیے یا بُرے کرم کئے اور اُن کے بدلے میں اُسے سزا ملنی چاہیے لیکن حالات اُس کی اجازت نہیں دیتے۔ تو اُسے انعام کے بدلے میں دنیا میں اور اچھے کام کرنے کا موقعہ دیا جائے گا اور سزا کے بدلے میں اور بُرے کام کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ اور جزا یا سزا اُس کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔

ایسے ہی اگر یہ صورت پیدا ہو جائے کہ انسان ہے تو نیک لیکن اُسے تکلیف پہنچانے والے اسباب جمع ہو گئے ہیں تو اگر اُس موقعے پر ان اسباب کی قوت کے عمل کو کچھ دیر کے لیے روکا جا سکتا ہے تو اُس کے اچھے کرموں کے بدلے میں اُس کی مصیبت کو ٹال دیا جاتا ہے یا اگر مصیبت پورے طور پر ٹل نہیں سکتی، تو جس قدر حالات اجازت دیں اُس کی سختی میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اسباب تو چاہتے ہیں کہ کسی شخص کو انعام دیا جائے لیکن

وہ شخص بدکار ہے تو اُس کی بدکاری کو اُس نعمت کے ہٹانے میں صرف کیا جائے گا۔ یعنی انعام کے اسباب کے خلاف جو بات پیدا ہو گئی ہے، اُس کا حل یوں کیا جائے گا۔ کہ اُس کی بدعملی کی سزا کے طور پر اُسے آرام سے محروم کر دیا جائے گا +

اگر حالات ایسے ہوں کہ وہ اعمال کے مناسب ہیں جیسے کرم اچھے ہیں اور نعمت پہنچانے والے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں یا کرم بُرے ہیں اور عذاب پہنچانے والے حالات بھی موجود ہیں تو اُس صورت میں وہ انعام یا عذاب مکمّل صورت میں ظاہر ہوتا ہے +

اس قاعدے کا استثنیٰ کبھی کبھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسباب کے سلسلے میں کوئی تبدیلی کرنا کائنات (برھمانڈ) کی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ اور ان اسباب کے سلسلے کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور انسان جو کام کر رہے ہیں اُن کا نظام زیادہ ضروری نہیں ہوتا (یعنی یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسانوں کو اُن کے کرموں کا پھل جلدی دیا جائے) تو بدکار آدمیوں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے نعمت دے دی جاتی ہے تاکہ اسباب کا تقاضا پورا ہو۔ اور نیک لوگوں کو تنگی کے اسباب پیدا ہو جانے کی وجہ سے بظاہر تنگی میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اسباب کا تقاضا پورا ہو۔ لیکن اس تنگی سے بھی نیک انسانوں کو فائدہ ہی پہنچتا ہے کہ اُن کی بہیمی قوت کی درستی ہوتی رہتی ہے اور

یہ بات انہیں سمجھا دی جاتی ہے تو وہ اس پر راضی ہو جاتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو کڑوی دوا کا فائدہ سمجھا دیا جائے تو وہ کڑوی دوا شوق سے پی لیتا ہے۔ نیچے لکھی ہوئی حدیثوں کے یہی معنی ہیں :-

(۱) مومن کی مثال ہری بھری کھیتی کی طرح ہے۔ کہ ہوائیں اُسے اُونچا نیچا کرتی رہتی ہیں کبھی لِٹا بھی دیتی ہیں۔ کبھی سیدھا کھڑا کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مدت پوری ہو جاتی ہے۔ جب تک اُسے اس دُنیا میں رہنا ہے۔ اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی طرح ہے کہ کوئی ہلانے والی چیز اُسے ہلا نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ وہ یکایک جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے۔

(۲) مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، مرض سے ہو یا کسی اور سبب سے، تو اللہ تعالٰے اس کے ذریعے سے اُس کی غلطیاں اس طرح گرا دیتا ہے جیسے پت جھڑ میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

کبھی ایک اقلیم (ملکوں کا مجموعہ) ہوتی ہے کہ اُس پر شیطان کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور اُس کے تمام باسی (باشندے) حیوان بن جاتے ہیں (یعنی ان کا ملکی اختیار اور ضمیر غائب ہو جاتا ہے) اس لیے ان کی جزائیں ایک عرصے کے لئے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ پھر یکایک اللہ کی سزا اُنہیں آلیتی ہے اور برباد ہو جاتے ہیں) قرآنِ حکیم کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ وَمَا ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالباساء والضراء لعلھم یضرعون ہ ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا وقالوا قد مس اباءنا الضراء والسراءُ فاخذناھم بغتۃ وھم لا یشعرون ولوان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون [یعنی کوئی سوسائٹی ایسی نہیں جس میں ہم نے کوئی نبی نہ بھیجا ہو اور پھر ہم نے ان لوگوں کی تنگی اور تکلیف سے پکڑ دھکڑ نہ کی ہو تاکہ وہ لوگ ہمارے حکموں کے آگے جھکنا شروع کر دیں۔ پھر ہم تنگی کو آرام سے بدل دیتے ہیں تو وہ اس تکلیف کو بھول جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کو بھی تنگی اور آرام پہنچتا رہا ہے (یعنی یہ قدرتی اسباب کا نتیجہ ہے جیسے انسان کے کرموں سے کوئی علاقہ نہیں) پھر ہم انہیں ایسی حالت میں پکڑ لیتے ہیں کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اگر یہ گاؤں والے لوگ (یعنی مختلف سوسائٹیاں) بات مان جائیں اور انصاف کے قانون کی پیروی کرنے لگیں تو اُن پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ لیکن جب اُنہوں نے جھٹلایا تو نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے انہیں ان کے کرموں کے

بدلے پر اچھی طرح سے پکڑ لیا[۵۱]

دنیا میں نوکروں کا بدلہ | خلاصہ یہ کہ دنیا میں جزا دینے کے مسئلے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سردار دوسرے کام میں مصروف ہو اور اپنے نوکروں کو جزا دینے پر پوری توجہ نہ دے سکے (گو ضمنی طور پر جس قدر موقعہ آتا گیا انہیں سزا دی جاتی رہی) جب قیامت کا دن آئے گا اور یہ دنیاوی نظام ختم ہو جائے گا تو ایسی حالت ہو جائے گی جیسے وہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر جزا دینے کی طرف متوجہ ہو گا۔ (اس لئے تمام کاموں کی جزا جو باقی رہ گئی تھی پوری کر دی جائیگی۔ قرآن حکیم کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:۔ سنفرغ لکم ایھا الثقلان (یعنی اے انسانوں اور جنوں کی جماعتو! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہو جائیں گے[۵۲])

دنیا میں جو جزا ملتی ہے اس کی کئی صورتیں ہیں:۔

(۱) انسان کے دل میں خوشی اور اطمینان یا رنج اور پریشانی پیدا کر دی جاتی ہے۔

(۲) اس کے بدن میں کوئی تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے جیسے غم

---

۵۱ سورہ اعراف: ۹۴، ۹۵، ۹۶

۵۲ سورہ الرحمٰن: ۳۱

اور خوف سے کوئی بیماری لگ جائے۔ جیسے آنحضرت صلعم نبوت سے پہلے ننگے ہو جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے[ا]

(۳) اُس کے مال یا اولاد میں تکلیف یا آرام پیدا کر دیا جاتا ہے۔

(۴) لوگوں اور فرشتوں بلکہ جانوروں کو الہام کیا جاتا ہے کہ اس سے اچھا یا بُرا سلوک کریں۔

(۵) الہام یا احالہ (حالات کے بدلنے) کے ذریعے سے کسی اچھی حالت کے قریب کر دیا جاتا ہے یا بُری حالت کے قریب پہنچا دیا جاتا ہے)۔

جو شخص اس مسئلے کو جتنا ہم نے اس باب میں لکھا ہے سمجھ لے گا اور ہر بات کو اُس کے ٹھیک موقعے پر رکھے گا وہ بہت سی مشکلوں سے بچ جائے گا۔ جیسے ایک حدیث میں تو

[ا] بیت اللہ (خانہ کعبہ) کی مرمت کے زمانے میں جب آپ ابھی نبی نہیں بنائے گئے تھے آپ بھی مرمت میں شریک تھے۔ آپ کے بدن پر صرف ایک چادر تھی اور پتھر ننگے کندھوں پر اُٹھانے کی وجہ سے کندھے چھل گئے تھے۔ مردوں کا ننگا ہونا اس زمانے میں عربوں میں عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عباس نے آپ کو مشورہ دیا کہ چادر اتار کر کندھوں پر رکھ لیں تاکہ کندھے پتھروں سے زخمی نہ ہوں۔ جونہی آپ نے ایسا کیا آپ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

آتا ہے کہ نیکی رزق کی زیادتی کا سبب ہے۔ اور بدکاری رزق میں نقصان پہنچاتی ہے۔ اور دوسری حدیث میں آتا ہے کہ بدکار لوگوں کو نیکیوں کا بدلہ دُنیا میں جلدی پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ انسانوں میں زیادہ تکلیف اُس آدمی کو پہنچتی ہے جسے زیادہ نزدیکی اور بزرگی حاصل ہو، یعنی جو سب سے اچھا ہو۔ پھر اسی طرح درجہ وار کم ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی حدیثیں ہیں (اگرچہ دیکھنے میں یہ حدیثیں ایک دوسرے کے خلاف نظر آتی ہیں۔ لیکن دُنیا میں کرموں کا پھل ملنے کے جو قاعدے ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں اُنہیں سامنے رکھ کر ان حدیثوں پر غور کیا جائے تو ان کا اختلاف دُور ہو جائے گا اور ہر ایک حدیث اسباب کے نظام کے کسی نہ کسی پہلو کو ظاہر کرتی نظر آئے گی)، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

پندرھواں باب (۱۵)

انسان کی موت کی حقیقت

پندرھواں باب (۱۵)

انسان کی موت کی حقیقت

مرکبات کی دو قسمیں مرکبات (Compounds) دو قسم کے ہوتے ہیں :-

(۱) کیمیاوی مرکبات (Chemical Compounds)

ان میں دو چیزوں کے ملنے سے نئی خاصیتوں والی تیسری چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی خاصیتیں مرکب کے اجزا کی خاصیتوں سے الگ ہوتی ہیں جیسے کوئلے کے جلنے سے راکھ پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) امتزاجی یا غیر کیمیاوی مرکّبات (Mixtures)

ان میں دو چیزوں کے ملانے سے کوئی نئی خاصیّتوں والی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ان چیزوں کے ملنے سے جو چیز پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی خاصیتیں وہی ہوتی ہیں جو اُس کے اجزا میں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ جیسے پانی اور کھانڈ کے ملنے سے شربت بن جاتا ہے ✣

سلسلۂ ارتقا میں مرکّبات کا مقام | سلسلۂ ارتقا میں غیر کیمیاوی مرکبات کا دورہ ابتدائی دورہ ہے۔ اور جُوں جُوں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اُسی طرح کیمیاوی ترکیب زیادہ پیچیدہ اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ شاہ صاحبؒ اور اُن مُصنّفین کی اصطلاح میں جو اُن کی طرح سوچتے ہیں جہاں کہیں کیمیاوی ترکیب ہوگی۔ اُسے دو حصّوں میں تقسیم کر دینگے۔ ایک تو وُہی اجزا جن سے مرکب پیدا ہوتا ہے اُسے مادہ کہتے ہیں۔ اور اس کی ترکیب سے تیسری چیز نکل آتی ہے۔ اُسے صورت کہتے ہیں۔ اُس کی سلسلہ وار ترقی میں دوسرا کیمیاوی مرکب پیدا ہوتا ہے تو پہلے مرکب کی جو صورت ہوتی ہے وہ دوسرے مرکب کے لئے مادہ بن جاتی ہے۔ باریک نظر والے عالم جب کسی کیمیاوی مرکب کے ایک ایک جُز کو الگ الگ کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں۔ تو کوشش کرتے ہیں

کہ جتنے درجے صورت کے بیچ میں آ چکے ہیں۔ سب علیحدہ علیحدہ ممتاز ہو جائیں۔ اگر یہ کیمیاوی مرکب دسویں درجے کا ہے تو اُس کی آخری صورت کی نو صورتیں اور ہو جانی چاہئیں۔ جو مادے کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ایک حکیم کے دل کا اطمینان اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ہر صورت کے خواص ٹھیک طرح الگ الگ کر لیتا ہے۔ اُسے اس سے بحث نہیں ہوتی۔ کہ یہ خواص کہاں سے آئے ہیں۔ وہ اس کے لئے نیچر (NATURE) یا طبیعت یا اسی قسم کا کوئی موٹا سا لفظ استعمال کر کے اپنی تحقیقات کو یہاں ختم کر دیتا ہے۔ پھر اُس سے ایک زیادہ اُونچے علم میں بحث ہوتی ہے۔ کہ طبیعت کے یہ خواص پیدا کیوں ہوئے؟ اِن کی کیا علّتیں ہیں؟ اس کی بحث علیحدہ ہے۔ لیکن طبیعیات (Physics) کی بحث کے اس درجے میں دونوں فنون کو ملانا نہیں چاہیے۔

طبیعات کے پُرانے عالموں کا یہ مانا ہوا نظریہ تھا کہ یہ کائنات چار عُنصروں (Elements) سے بنی ہے: پانی۔ ہوا۔ مٹی۔ آگ۔ اِن کے ملنے سے آگے چیزیں بنتی ہیں۔ "عنصر" کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اُس کی آگے تحلیل[1] نہ ہو سکے۔ یہ نظریہ

---

[1] اجزا الگ الگ کرنا

آج کل کی تحقیقات کے مطابق بظاہر بہت ہی قابل اعتراض نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ "عنصر" ایسے ہیں۔ کہ انسان تھوڑی سی محنت سے انہیں تقسیم کرسکتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن لوگوں کا مطلب فقط یہ تھا۔ کہ چند عام مفرد چیزیں جو عام لوگوں کو محسوس ہوتی ہیں۔ ان پر بُنیاد رکھی جائے۔ یہ چیزیں "(آگ - پانی - مٹی - ہوا)" اگرچہ آگے چل کر علمی طور پر عنصر ثابت نہ ہوں۔ بلکہ خود مرکبات ہوں۔ تو یہ اُن کے مطلب کے مخالف کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس کا انکار نہیں کرتے۔ اُنہوں نے عام ذہنیت کو خطاب کرنے کے لئے ایک سطح فرض کرلی ہے۔ اُس کی ایک مثال ریاضی میں ملتی ہے ریاضی کی عام بحثوں میں یہ بات فرض کرلی گئی ہے۔ کہ ہم ایک چیز کو نقطہ کہہ سکتے ہیں۔ جس سے ایک سیدھا خط کھینچ سکتے ہیں۔ ایک پُورا گول دائرہ بنا سکتے ہیں۔ اگر بچّوں کے سمجھانے کے واسطے یہ اصول موضوعہ (Postulates) ریاضی میں ابتداءً اُصول قرار نہ دیئے جائیں۔ تو ریاضی کے مسئلوں کا سمجھنا نہایت مشکل ہوجائے گا۔ آگے دُوسرے فنون میں جاکر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نقطہ فرض کرنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ ایک سیدھا خط کھینچ لینا ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی

ایک خاص دائرہ بنانے میں بہت اُونچ نیچ سامنے رہتی ہے
اسی طرح ہماری رائے یہ ہے کہ ان چار عناصر کو عنصر فرض
کر لینا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حقیقتاً یہ عنصر ہیں۔ اس
سے یہ فائدہ ہوگا کہ طبیعیات کی پُرانی تحقیقات کا سلسلہ
نئی تحقیقات کے سلسلے سے مِل جائے گا +

پُرانے طبیعیات کے عالموں نے عناصر سے اُوپر معدنیات
(لوہا۔ تانبا وغیرہ) کا درجہ فرض کیا ہے۔ عناصر کے بعد یہ
پہلی کیمیاوی صورت ہے۔ اس کے بعد نباتات ہیں (یعنی
بڑھنے والے درخت وغیرہ) اس کے بعد تیسرا دَور اُنہوں
نے حیوانات کا بنایا ہے۔ اور اس کے بعد چوتھا دَور انسانیت
کو بنایا ہے +

مادّی دُنیا کی تقسیم | جاننا چاہیئے کہ معدنیات، نباتات، حیوانات اور
انسانوں کی صورتوں کے لئے سواری (Vehicle) (یا مادہ)
مخصوص ہوتا ہے۔ جو دوسری صورت کے لئے مادے کا کام نہیں
دے سکتا۔ اسی طرح یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اگرچہ ظاہر
میں ان چار صورتوں (معدنیات۔ نباتات۔ حیوانات اور انسان) میں شبہ
پڑتا ہو۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا ایسا اوّل درجے کا کمال ہے جو دوسروں
میں نہیں پایا جاتا۔ جب عناصر (آگ۔ پانی۔ مٹی۔ ہوا) کے باریک باریک

اجزا کر دیئے جائیں۔ اور اُنہیں مختلف طریقوں سے مرکب کرنا شروع کیا جائے۔ جیسے کسی میں ایک عنصر بڑھا دیا جاتے۔ اور کسی میں دو بڑھا دیا جائے تو اس سے (۱) ایسے مرکب ثنائی پیدا ہوں گے جن کے دو دو جز ہیں۔ جیسے "بھاپ" (جو پانی اور آگ سے بنتی ہے) "غبار" (جو مٹی اور ہوا سے بنتا ہے) دُھواں اور تر مٹی (یعنی پانی سے بھیگی ہوئی) اور زمین ہل جوتی ہوئی۔ اور آگ کی چنگاری اور شعلہ (یہ دو دو اجزا کے ہیں) (۲) ایسے ثلاثی مرکب پیدا ہوں گے جن کے تین تین اجزا ہیں۔ جیسے خمیر کردہ مٹی۔ پانی کے اُوپر کی سبزی یا کائی وغیرہ (۳) رباعی مرکبات ہوں گے جن کے اجزا چار چیزیں ہوں گی۔ ان کی مثالیں بھی اسی طرح کی ملیں گی۔ جن کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں۔ ان سب قسم کے مرکبات کے جو خواص ہیں۔ وہ اجزا کے خواص کے مجموعے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اور چیز بڑھتی نہیں ہے [یعنی غیر کیمیاوی مرکبات ہیں] ان کا نام "کائنات الجو" ہے۔ یعنی اس فضا (جوّ) میں پیدا ہونے والی چیزیں ۔

معدنیت اس کے بعد کیمیاوی مرکبات میں سے پہلا درجہ معدنیّت کا آتا ہے۔ معدنیت غیر کیمیاوی مرکبات سے ترقی پا کر پیدا ہوتی ہے۔ (یعنی عنصریت سے ترقی ہوتی ہے۔ تو مادہ سب سے پہلے معدنیّت کی شکل اختیار کرتا ہے) اور اس میں ایک نوع کی خاصیتیں پائی جاتی

ہیں۔ اور پھر وہ خاصیتیں محفوظ رہتی ہیں [یعنی اپنے غیر کیمیاوی مرکبات سے جب اس میں ایسی طاقت آجاتی ہے۔ جو اسے لوہا بنا دیتی ہے۔ تو اب "لوہا ہونے" کو اُس کی نوعی صورت کہا جائے گا۔ یہی معدنیّت ہے اور جو اجزاء ہیں۔ وہ اُس کا مادہ یعنی سواری رہیں گے۔ یہ ترکیبی صورت جس طرح نئے خواص پیدا کرتی ہے۔ ویسے ہی اُن خواص کو محفوظ بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ لوہا جہاں کہیں پایا جائے گا اُس کے خواص یکساں ہوں گے۔ اور اس میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ تو ان خواص کو پیدا کرنے اور ان کی حفاظت کرنے والی طاقت کا نام حدیدیّت (لوہا پن) یا معدنیّت ہوگا]۔

بڑھنے والے اجسام | اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے کیمیاوی مرکبات کی نئی صورت ظاہر ہوئی۔ جسے نامویت کہتے ہیں یعنی بڑھنے والی طاقت یہ بنے بنائے مزاج والے جسم کے ذریعے سے کام کرتی ہے۔ اور عناصر اور کائنات الجوّ (فضا) کی قوّتوں کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کا کمال عملاً پیدا ہو جاتا ہے۔ جو جسمانی قوتیں اس نامویّت سے پہلے ظاہر نہیں کر سکتیں۔

حیوانیّت | اس کے بعد حیوانیّت کا دَور آتا ہے۔ تو وہ ہوائی رُوح کو جس میں غذا ہضم کرنے اور بڑھانے کی قوّتیں موجود تھیں۔ اپنی سواری

بنالیتی ہے۔ اوراس کے طول وعرض میں حسّ اور ارادے کے ذریعے سے کام کرتی ہے۔ وہ کہیں تو کوئی مفید چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کہیں کسی نقصان دینے والی چیز سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہے (یعنی اب اس میں حسّ اور ارادہ آگیا ہے۔ اپنے نفع اور نقصان کی تھوڑی سمجھ بھی آگئی ہے)۔

انسانیت اس کے بعد انسانیت آتی ہے۔ یہ رُوح ہوائی یا نسمے کو جو حیوانی بدن میں تصرّف کر رہی تھی۔ اپنی سواری بنالیتی ہے۔ اور اپنی توجہ اُن اخلاقی قوتوں کی طرف کرتی ہے۔ جو کسی کام کے لئے کھڑا ہونے (انبعاث) یا کسی کام سے پیچھے ہٹنے (انخناس) کی قوتوں کے مرکز ہیں۔ وہ ان اخلاق کو نہایت خوبصورت بناتی ہے ان کی سیاست کو خوب چلاتی ہے۔ اور ان کو اُوپر (حظیرۃ القدس) سے آنے والی چیزوں کی جلوہ گاہ بنادیتی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ اب ان مرکّب در مرکّب صورتوں میں اگرچہ سرسری نظر سے اشتباہ (شبہ) ہوتا ہے (کہ سارے کام انسانیت کر رہی ہے) لیکن باریک نظر سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ ہر منبع کے آثار الگ طور پر اس منبع سے لگے ہوئے ہیں۔ اور ہر ایک صورت الگ قوت سے کام لے رہی ہے [چنانچہ حیوانیت کے کام سرانجام دینے کے لئے حیوانیت انسانیت کے نیچے اسی طرح جسم میں موجود ہے۔ جیسے

انسانی وجود سے باہر حیوانیت پائی جاتی ہے۔ اور نامویت کے کام سرانجام دینے کے لئے حیوانیت کے نیچے قوت نامی اپنی اصلی شان میں موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح معدنیت اور پھر ہر ہر عنصر کی قوت کا خیال کر لینا چاہیئے] یہ تو ظاہر ہے کہ ہر صورت کے لئے ایک مادہ ہونا چاہیئے۔ جس پر وہ صورت قائم ہو سکے۔ اور مادے کا اس صورت کے لیے موافق اور موزوں ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ صورت کی مثال ایسی ہے جیسے موم کا ایک انسان بنا لیا جائے۔ تو یہ انسانی صورت موم کے بغیر اور اُس سے علیحدہ نہیں ملے گی۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ انسان کا مخصوص نفس (جسے عام اصطلاح میں نفس نُطقیہ کہا جاتا ہے) مَوت کے وقت مادے کو بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ وہ غلطی کرتا ہے (یعنی صورت کا مادے کے بغیر موجود ہونا ناممکن ہے)۔

<u>نفسِ انسانی کے دو مادے</u> | ہاں نفسِ انسانی کے لیے (دو مادے ہیں):۔

(۱) جس سے اس کا سیدھا (DIRECT) تعلق ہے۔ اور جسے ہم روح ہوائی یا نسمہ کہتے ہیں۔

(۲) بالواسطہ (INDIRECT) یعنی انسانی جسم جس سے انسانی روح کا تعلق براہِ راست نہیں ہے۔

<u>مرنے کے بعد کی حالت</u> | جب انسان مرتا ہے تو یہ زمین کا مادہ (یعنی انسان

کا بدن اُس سے چھن جاتا ہے۔ اور اُس کے چھن جانے سے اُس کے نفس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور نفس نطقیہ . . . . . . نسمے یا روح ہوائی کے مادے پر اپنی سواری قائم رکھتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک ماہر خوشنویس جسے لکھنے کا شوق ہو اگر اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو اس میں لکھنے کی مہارت ویسی ہی قائم رہتی ہے[1]۔

(۲) دوسری مثال اس شخص کی ہے جو چلنے کا شوقین ہو۔ جب اُس کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ تب بھی اس میں چلنے کی مہارت رہتی ہے۔

(۳) تیسری مثال اُس سُننے اور دیکھنے والے انسان کی ہے۔ جسے اندھا اور بہرا کر دیا گیا ہو۔ انسان بعض کام ایسے کرتا ہے۔ اور بعض

---

[1] بعض بادشاہوں نے اپنے خاص منشیوں سے ناراض ہو کر اُن کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ پھر جب اُن سے راضی ہو گئے۔ تو اُن کو معاف کر دیا۔ اُن کے متعلق اسلامی تاریخ میں ذکر آتا ہے۔ کہ وہ قلم کو اپنے ٹنڈ سے باندھ لیتے تھے۔ اور شاہی فرمان اس خوبصورتی سے لکھتے تھے جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے لکھتے تھے۔ ابن مُقلہ نامی خوشنویس (کاتب) سے یہی بات پیش آئی تھی۔

اخلاق ایسے حاصل کرتا ہے۔ جو اُس کے دل کی اپنی خواہش ہوتی ہے اب اگر اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ضرور یہ کام کریگا۔ اور اُن کے خلاف کبھی نہیں کر سکے گا۔ اور بعض کام اور بعض اخلاق ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی کرتا ہے یا باہر کے کسی اثر کے سبب سے کرتا ہے۔ جیسے بھوک اور پیاس کے اثر سے کھانے پینے لگ جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسی عادت نہ بن جائے جس کو چھوڑنا ناممکن ہو۔ یہ عارضی کام ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اسباب جن کی وجہ سے وہ یہ کام کرتا ہے نہیں رہتے تو وہ یہ کام بھی کرنے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہے کہ ایک انسان ہے جو کسی خاص آدمی سے دوستی رکھتا ہے یا کسی خاص پیشے سے محبّت رکھتا ہے مثلاً شاعر یا طبیب سے۔ اُس حالت میں یہ شخص مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ لباس اور وضع میں ان لوگوں کی پیروی کرے۔ اب اگر اُسے اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے۔ اور وُہ اپنی وضع بدل لے۔ تو اُس کے دل پر کوئی اثر نہ ہوگا (یعنی اُسے کچھ پرواہ نہ ہوگی) لیکن بعض انسان ایسے ہوتے ہیں۔ کہ وہ ایک خاص وضع کو جی جان سے پسند کرتے ہیں۔ اب اگر اُنہیں اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ اپنی وضع چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

انسانوں کی دو قسمیں ہیں:۔

انسان کی دو قسمیں :-

(۱) بیدار طبع انسان | بعض انسان ہیں کہ وہ طبعی طور پر بیدار ہوتے ہیں اُن کے سامنے بہت سی چیزوں کا ذکر آ جاتے۔ وہ ان میں ایک امر کو جو سب میں سانجھا ہو۔ بھانپ لیتے ہیں۔ تو ان کی طبیعت درحقیقت علّت (سبب) کو یاد رکھتی ہے۔ اور معلولات (نتیجوں) کو چھوڑ دیتی ہے۔ اور ان کی طبیعت میں جو ملکہ اور مہارت محفوظ رہتی ہے۔ اُسے ہی پاس رکھتی ہے اور اُن کاموں کو یاد نہیں رکھتی۔ جن سے وہ ملکہ پیدا ہوتا ہے +

(۲) غافل انسان | دوسری قسم ان انسانوں کی وہ ہے۔ جن کی طبیعت خوابیدہ اور غافل واقع ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ وحدت کو ترک کر کے کثرت کی طرف مائل رہتے ہیں (یعنی ایک امر جو اُن میں سانجھا ہے اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ اکیلی اکیلی چیز کا خیال کرتے ہیں) وہ خلق اور مہارت کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف کام کو یاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح وہ رُوح کو نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ صورتوں کو یاد رکھتے ہیں +

مرنے کے بعد جسم کی حالت | جب انسان مر جاتا ہے تو اُس کا زمین کا بدن (جسد) پھٹ کر زمین میں مل جاتا ہے۔ مگر اُس کا جو نفس ناطقہ (روح) ہے۔ وہ رُوح ہوائی یا نسمے کے ذریعے سے باقی رہتا ہے۔ اب اس (نفسِ ناطقہ) کے اندر جو طبعی چیزیں ہیں اُن کے لئے فارغ ہو جاتا ہے۔ [اس کے اندر جو اصلی خاصیتیں ہوتی ہیں ان کے اظہار کے لئے

مناسب فضائل جاتی ہے] اور جو کام وہ دُنیاوی زندگی کی ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لئے بغیر دلی خواہش کے کرتا تھا۔ وہ ان سب کو چھوڑ دیتا ہے۔ اب اس میں وہی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں۔ جنہیں وہ اپنے اندر ذاتی طور پر محفوظ رکھتا تھا۔ اُس وقت اُس کی ملکیّت ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اور اُس کی بہیمیّت کمزور ہوتی رہتی ہے۔ اُس کے اُن تمام کاموں کے متعلق جو حظیرۃ القدس میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ حظیرۃ القدس سے یقین ٹپکنے لگتا ہے ؞

[اس کی مثال ایسی ہے۔ کہ ایک آدمی ایک ملک میں ایک عرصہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس جگہ اُس کے دوست اور دشمن پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ہر واقعہ کے متعلق وہ جو فیصلہ کرتا ہے۔ اُس کے مطابق عمل کرتا رہتا ہے۔ چونکہ اُس وقت وہ بہت مصروف ہوتا ہے اس واسطے اُن کے تمام فیصلے صحیح نہیں ہوتے، اب اُسے اس ملک کو یکلخت چھوڑنا پڑتا ہے اور ان لوگوں سے اُس کا قطع تعلق ہو جاتا ہے۔ اب پچھلے فیصلے جو اُس کے دماغ میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ اُن پر نظرثانی کرتا ہے۔ اور افسوس کرتا ہے۔ کہ کہیں تو دوست پر زیادتی کی ہے۔ اور کہیں دشمن کو زک دے سکتا تھا۔ اور بے توجّہی سے شکست کھا آیا۔ اس طرح اُس نے جو اچھے کام کیے ہیں اُنھیں یاد کر کے طبیعت میں خوشی

پاتا ہے۔ اور جو غلط کام کیے تھے انہیں یاد کرکے درد محسوس کرتا ہے۔ اس تھوڑے سے حصّہ زندگی کو اُس کے دماغ نے جس طرح محفوظ رکھا تھا۔ اسی طرح انسان کی ہر نقل و حرکت کو حظیرۃ القدُس محفوظ رکھتا ہے +

موت کے بعد انسان کو حظیرۃ القدُس کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حظیرۃ القدُس انسان کی طبیعت کا طبعی مرکز ہے۔ صوفیائے کرام عموماً ایک حدیث بیان کیا کرتے ہیں کہ "حب الوطن من الایمان" (وطن کی محبت ایمان کا جزء ہے) وہ اس کا مطلب یہی قرار دیتے ہیں کہ ملکیت کو حظیرۃ القدس سے محبّت ہے۔ وہ (ملکیّت) عام لوگوں کو موت کے بعد نظر آتی ہے۔ مگر صوفیائے کرام اسے اس زندگی میں حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ محبّت وطن کی ہے۔ اور یہ ایمان کا جزء ہے]

[غرض ملکیت کو حظیرۃ القدُس کی طرف جب طبعی طور پر توجّہ ہوتی ہے۔ اُسے آہستہ آہستہ تمام کارروائی جو وہاں محفوظ ہے نظر پڑنے لگتی ہے] اُس وقت اُسے درد پہنچنے لگتا ہے یا مسرت کا انعام ملنے لگتا ہے +

ملکیّت اور بہیمیّت کا تعلق | جب دُنیا میں ملکیت بہیمیّت کے ساتھ مل کر رہتی ہے تو بعض اوقات

اس میں ڈوب جاتی ہے جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بہیمیت کی کچھ چیزیں ضرور مان لیتی ہے۔ اور اُس سے کسی قدر اثر لے لیتی ہے۔ چونکہ یہ طبعی امر ہے۔ اس لئے اسے مضر نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن پورے نقصان کی بات یہ ہے کہ انسان میں ایسے اخلاق کی صورتیں پختہ ہو جائیں جو ملکیت کے تقاضوں کے بالکل ضد واقع ہوتے ہیں۔ اور نہایت نفع دینے والی بات یہ ہے کہ اُس میں ایسے اخلاق کی صورتیں پختہ ہو جائیں۔ جو ملکیت سے انتہائی مناسبت رکھتی ہیں +

مخالف صورتیں | مخالف صورتیں مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) اس کا اپنے مال اور اہل و عیال سے اتنا گہرا تعلق ہو جائے کہ اُسے یقین نہ آتا ہو کہ ان دونوں چیزوں کے علاوہ بھی کوئی اور چیز ہے جسے حاصل کرنا اُس کی انسانیت کے لئے ضروری ہے اس طرح ادنے درجے کی عادتیں اپنی طبیعت میں پختہ کرلے۔ اور اس طرح سماحت (یعنی طبیعت میں گندی باتیں چھوڑنے کی عادت) کے خلاف باتیں اُس کے اندر جمع ہو جائیں +

(۲) وہ گندگیوں میں لتھڑا رہتا ہو +

(۳) خدا تعالےٰ کو نہ پہچان کر تکبر کرتا ہو۔ اپنے ایسے پروردگار کے حضور میں کبھی نیازمندی کے ساتھ نہ آتا ہو۔ یہ عادتیں خُلقِ احسان کے خلاف ہیں +

(۴) حظیرۃ القدس نے جو حق کی مدد کرنے، اس کے کام کی شان کو بڑھانے، نبیوں کے آنے اور انسانی سوسائٹی میں اچھا نظام (سب انسانوں کو فائدہ پہنچانے والا) قائم کرنے کی طرف جو توجہ کر رکھی ہے وہ ان باتوں کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حظیرۃ القدس کی جانب سے اُن پر بُغض اور لعنت برسنے لگ جاتی ہے +

موافق صورتیں | ملکیت کے مناسب صورتیں ایسی ہوتی ہیں جیسے :-

(۱) ایسے کام کرنا جن سے طہارت و پاکیزگی پیدا ہوتی ہو۔ (خواہ وہ بدن کی ہو یا خیالات کی یا کاموں کی) +

(۲) ایسے کام کرنا جن سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی آئے (یعنی خدا کے سامنے جو سب کا پیدا کرنے والا ہے اپنی عاجزی کا اظہار کرنا) +

(۳) اُن اعمال کا کرنا جن سے ملائکہ کی یاد تازہ ہوتی ہو +

(۴) ایسے عقائد (پختہ اُصول) دل میں پختہ کرنا جن سے دُنیا کی زندگی کو اپنی آخری اُمید نہ بنائے +

(۵) اُس کی طبیعت میں سماحت ہو (یعنی طبیعت ایسی

کہ بُرائی کو دل میں جگہ نہ دے) ٭

(۶) معاملات میں نرمی کرنے والا ہو یعنی نرم دل ہو ٭

(۷) وہ اپنی طبیعت کو اتنی پاک بنائے کہ ملاء اعلےٰ کی دُعائیں اور توجّہ اُس کی طرف رہیں۔ اس لئے کہ یہ پسندیدہ نظام کی تائید کرتا ہے ٭

[یعنی اگر مرنے کے بعد اُس کی طبیعت میں یہ اچھی باتیں محفوظ ہوں گی تو اُسے آرام و راحت ملے گی اور اگر اس کی ضد ہیں تو اسے تکلیف ہوگی۔ یہ کوئی نئی زندگی نہیں بلکہ پہلی (دُنیا کی) زندگی ہی کا تسلسل ہے] ٭

سولھواں باب (۱۶)

برزخ

سولھواں باب (۱۶)

برزخ

انسانی زندگی کی تقسیم جب اس دنیا میں انسان مرجاتا ہے تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اُس کی اگلی ترقی باقاعدہ سمجھنے کے لئے اس جسمانی مثال کو سامنے رکھنا چاہئے۔ جو انسانی نطفے کے رحم میں قرار پانے کے وقت سے موت تک طاری ہوتی رہتی ہے۔ اسے آسانی سے دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) انسان کی انفرادی زندگی:۔

(ا) پہلا حصہ ماں کے پیٹ میں (ب) دوسرا بچپن کا زمانہ۔

(۲) انسان کی اجتماعی زندگی یعنی ایسی زندگی جب انسان خود کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اجتماعی زندگی کے مختلف درجے ہیں :-

(۱) وہ اپنے گھر کا سردار بنتا ہے۔

(۲) اس کے بعد محلے یا گاؤں کا سردار بنتا ہے۔

(۳) پھر شہر کے انتظام چلانے میں ایک رکن بنتا ہے۔

(۴) وہ ملک کی انتظام کرنے والی مشین کا ایک پرزہ بنتا ہے۔

(۵) وہ دنیا کے عالمگیر نظام کی مشین چلانے کا ایک پرزہ بنتا ہے۔

اسی طرح موت کے بعد انسان کی انفرادی زندگی "قبر سے" تعبیر کی جاتی ہے۔ اور اجتماعی زندگی حشر سے شروع ہوتی ہے۔ موت کے بعد کی زندگی کے لئے دو ایمانی عقیدے زیادہ کام آتے ہیں۔ اور ان کی حقیقت مرنے کے بعد ہی اچھی طرح کھلتی ہے۔

(۱) اللہ پر ایمان۔

(۲) مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان۔

انسانی نوع کے تین طبقے ان دونوں عقیدوں کو سمجھنے میں انسانی نو

مختلف طبقوں میں بٹ جاتی ہے ۔

(۱) عام طبقہ | لوگوں کا عام طبقہ ایسا سمجھا جاتا ہے۔ جن کے علم حاصل کرنے کا زیادہ مدار ظاہری حواس پر ہوتا ہے۔ وہ اندرونی حواس سے تو کام لیتے ہیں۔ مگر اُنہیں محسوس نہیں ہوتا۔ کہ وُہ ظاہری حس کے سوائے کسی اَور قوت سے بھی کام لے رہے ہیں۔

(۲) بیچ کا طبقہ | دوسرا طبقہ معنوی حواس والے لوگوں کا ہے۔ یہ اپنا علم زیادہ تر انہی حواس سے لیتے ہیں ۔

انسان کی سوچنے والی قوتوں کے تین درجے ہیں :-

(۱) انسان مادی چیزوں کا تصوّر کرتا ہے۔ تو چیز کی تصویر مع مادی خواص کے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ہم نے ایک انسان کو ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔ یہ حواسِ ظاہری کا کام تھا۔ اس کے بعد ہم نے آنکھیں بند کر کے اُس انسان کا تصوّر کیا۔ تو یہ زیادہ تر قوّتِ متخیّلہ (IMAGINATION) کا کام ہے۔ اس میں انسان اپنی شکل صورت رنگ وغیرہ سمیت تصوّر میں آجاتا ہے ۔

(۲) قوّتِ متخیّلہ سے اُوپر سوچنے کی ایک قوّت ہے جس میں مادی حالت نہیں آتی۔ اس کے ذریعے سے ہم مادّی چیزوں کی خاص شکل مقرر کئے بغیر سوچ سکتے ہیں اسے قوّتِ واہمہ کہتے

ہیں یہ بہت سی صورتوں کو ملا کر اُن کے درمیان ایک سا نجھی بات نکال سکتی ہے۔ مثلاً جس انسان کا تصوّر ہم نے اپنی قوّتِ متخیلہ کے ذریعے سے بنایا تھا۔ اُس کی تعلیمی حالت پر غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس نے پچھلے دس سال میں کیا کیا کام کئے ہیں۔ اس وقت ہماری قوت واہمہ کام کرتی ہے +

انسانوں کے دوسرے طبقے کے علوم زیادہ تر قوتِ متخیلہ اور قوّتِ واہمہ سے پیدا ہوتے ہیں +

(۳) اُونچا طبقہ | قوّت واہمہ ایک فرد کے حالات پر بغیر مادی خاصیتوں کے غور کر سکتی ہے۔ لیکن وہ جماعت کے کام پر غور نہیں کر سکتی۔ جو قوّت یہ کام سرانجام دیتی ہے۔ اُس کا نام "عقل" ہے +

عقلی قوّت کی تخیّل اور وہم کے ساتھ وہی نسبت ہے جو تخیّل اور وہم کی حواسِ ظاہری کے ساتھ ہے۔ عقلی قوّت مادی قوّتوں میں سے سب سے لطیف قوّت ہے۔ جو انسان درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جاتے ہیں اُن کے معلومات کا زیادہ ذخیرہ عقلی قوّت ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ انسانیّت کا سب سے اونچا طبقہ ہے +

ان طبقوں میں خدا کا تصوّر | اللہ پر ایمان اور مرنے کے بعد کی زندگی

پر ایمان میں یہ تینوں طبقے شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک طبقہ اپنی ذہنیت کے مطابق اُس کا مفہوم مقرر کر لیتا ہے۔
نچلے طبقے کے لئے خُدا کا ماننا اُس وقت تک ان کے ذہن میں نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک وہ اس کے ساتھ خُدا کی قدرت کا کوئی نمونہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اور جب اس طرح کوئی چیز اُن کے سامنے آجائے۔ یعنی وہ اپنی آنکھوں سے اُس چیز کو دیکھ لیں۔ اور اُن کی معنوی قوتیں یقین کر لیں۔ کہ یہ کام دوسرا نہیں کر سکتا۔ اُس وقت اُن کا ایمان اللہ پر ٹھیک ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگ اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ کہ وہ ظاہری حسّوں سے بے نیاز ہو کر خُدا کا تصوّر دل میں پیدا کریں۔

دوسرا طبقہ جب خدا کو مانتا ہے تو وہ پہلے طبقے کی چیزیں پہلے حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اُس کے ساتھ وہ مادی چیزوں میں علّت و معلول کے سلسلے کو مقرر کر کے اُنہیں ایک اعلےٰ ہستی پر ختم کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اللہ کا ایک دھندلا سا خیال اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔
اونچے طبقے کے لوگ اس درجے کو طے کرنے کے بعد قدرتِ الٰہی سے جو غیر مادی چیزیں پیدا ہوئیں انہیں ماننے

بنا عقل مادی نظام کو حل نہیں کر سکتی۔ اُن کے معلوم کرنے سے خدا تعالےٰ کا ایک تصوّر دل میں پیدا کر لیتے ہیں۔

ہم مادیات (مادی دُنیا کی چیزوں) میں بعض ایسی باتیں دیکھتے ہیں کہ اُن کے نتیجے بہت دُور جا کر نکلتے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسی کڑی نہیں ملتی جو باتوں کو ان نتیجوں سے ملا دے۔ انسانی عقل ایسی چیز کے بغیر جو ان دونوں کو ملا دے۔ اطمینان سے نہیں مان سکتی۔ کہ یہ نتیجہ اس اثر سے پیدا ہوا ہے۔ اب انسانی عقل مجبور ہے۔ کہ وہ چند غیر مادی طاقتیں فرض کر کے ان کڑیوں کو ملائے۔ اور یہ چیزیں سب پہلے ایک فرضیے (HYPOTHESIS) کے طور پر مانی جاتی ہیں۔ پھر تجربے اور مشاہدے کے بعد ہی حقائق (FACTS) میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اُس کی مثال طبیعیات میں روشنی اور بجلی وغیرہ کی کرنوں کی ہے۔ ان کرنوں اور اس قسم کی دُوسری شعاعوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے مسئلے کا حل اُس وقت تک کسی کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ جب تک ان کے لئے "ایثر" (ETHER) نامی ایک واسطہ (MEDIUM) فرض نہ کر لیا گیا۔ جو اب ایک حقیقت (FACT) کے

طمع پر مان لیا گیا ہے۔ ان حقیقتوں کو سمجھنا انسانی عقل کی انتہائی ترقی ہے۔ جب کوئی اونچے درجے کی عقل کا انسان خدا کو مانتا ہے۔ تو اُسے ان تمام غیر مادی طاقتوں میں پورا مؤثر (اثر کرنے والا) مانتا ہے۔ اور تمام مادی طاقتوں کو ان غیر مادی طاقتوں سے ملا دیتا ہے۔ اسی طرح اُس کی عقل میں جو حرکت و سکون ہوتا ہے۔ وہ اُسے بھی چند واسطوں (MEDIA) سے اللہ تعالےٰ کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ اُس وقت اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا تنہا مالک ہے۔ اور اُن میں تنہا متصرف ہے۔

جب خدا کو اس طرح ماننے والی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی مادی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک دوسرے سے مدد لینے دینے کی عادی بن جاتی ہے۔ تو وہ ایک تمدّن پیدا کر لیتی ہے۔ اس اجتماع کے مرکز میں انسانیت کا اونچا طبقہ ہمیشہ آ جاتا ہے۔ اور دوسرے طبقے مدرجہ وار اُس کے گرداگرد گھیرا ڈال دیتے ہیں۔ مرکزی قوّت ہمیشہ یہی کوشش کرتی ہے۔ کہ وہ سب سے نچلے طبقے کے لوگوں کو اتنا علم دے۔ کہ وہ اپنی پہلی منزل سے ترقی کر کے جس کا مدار انسانی قوّت متخیلہ پر تھا، دوسرے درجہ پر پہنچ جائیں اور

اپنی قوّت واہمہ سے کام لینا سیکھیں۔ پھر دوسرے درجے والوں کو اتنا علم دیا جاتا ہے۔ کہ پہلے درجے کے انسان جو اپنی عقلی قوّت کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ جتنی جگہ خالی کرتے جائیں۔ اُسے یہ ترقی کرنے والے انسان پُر کرتے رہیں اور نئی نسل جو پیدا ہوتی رہے، وہ ہمیشہ اس پہلے طبقے کی جگہ لیتی رہے۔ اور اس طرح اس اجتماع میں ارتقائی سلسلہ قائم رہے۔ کسی جماعت کا معنوی وجود اُسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے۔ جب تک اُن میں ترقی کا یہ سلسلہ قائم رہے۔ اس جماعت کی اس معنوی رُوح کو قائم رکھنے کا نام مذہب (RELIGION) ہے۔ مذہب اپنا ضروری اصول پہلے یہ قرار دیتا ہے کہ ہر انسان میں اللہ پر ایمان ہر درجے میں اُس کی اپنی سوچنے کی استعداد کے مطابق ہو۔

ان طبقوں میں مرنے کے بعد کی زندگی کا تصوّر | اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی کی بھی انسانوں کے مختلف طبقے اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق ایک تفسیر مقرر کر لیتے ہیں۔

سب سے پہلا طبقہ جو ظاہری حسیّات (حواس کے ذریعے سے معلوم ہونے والی باتوں) کا عادی ہے۔ اُسے جب

یہ یقین دلایا جائے کہ مرنے کے بعد اُس کی زندگی قائم رہے گی اور موت کے وقت جو بیج وہ یہاں سے لے چلا ہے وہ آگے چل کر اُسی طرح پھلیگا۔ اور پھولے گا۔ جس طرح بچّہ ماں کے پیٹ سے قوتیں لے کر نکلتا ہے۔ جو بچپن اور جوانی میں کھلتی اور پھولتی ہیں تو وہ مرنے کے بعد کی زندگی کا ایک دھندلا سا تصوّر اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ اس درجے کے انسان کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ یہ بدن گل سڑ جائے گا اور ایک معنوی بدن دیا جائیگا۔ جو رُوحِ ہوائی کا نتیجہ ہو گا۔ وہ انسانیت کا مصداق فقط اس جسمانی بدن (حسّی دُنیاوی بدن) کو سمجھتا ہے۔ اور اس میں اس سے زیادہ سمجھنے کی طاقت ہی نہیں۔ اسے اس یقین کے قائم کرنے کے لئے مختصر طور پر یہ سمجھا دیا جائے گا۔ کہ موت کے بعد اسے بدن ملے گا۔ اور اس کی ہر ایک خواہش پوری کی جائیگی۔ وہ ہمیشہ اسی تصوّر میں رہتا ہے۔ کہ وہ کھائے گا۔ اور پیئے گا۔ اُس کے بیوی بچّے ہونگے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ اپنی اگلی زندگی کا تصوّر کرتا ہے۔ یہ بات اگرچہ تھوڑے سے فرق کے بعد صحیح نکلے گی۔ مگر اُسے ایک لمبے زمانے تک اس فرق کا احساس نہیں ہو گا۔ اس لئے جو کچھ اُس نے یہاں سمجھا ہے۔ آگے جا کر اُسے اُس کو

رد کرنا نہیں پڑیگا۔ بلکہ وہ اسے ٹھیک پاتا چلا جلئے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک شخص خواب دیکھے اور اس میں اپنی تمام خواہشات کو پورا ہوتے دیکھے۔ مثلاً وہ دیکھتا ہے۔ کہ گھر ہے، بال بچے ہیں، باغ ہے۔ اور ہر قسم کے آرام و آسائش کے سامان مہیا ہیں۔ اور وہ ان تمام چیزوں کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اب اگر اس کی آنکھ نہ کھلے تو وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ادنےٰ طبقے کے انسانوں نے جو اچھے کام کئے وہ ایسے ہیں گویا انسانیت عام طور پر جو کچھ چاہتی ہے وہ پورا کیا۔ انہیں مرنے کے بعد ایک ایسے لمبے خواب سے واسطہ پڑے گا۔ جس میں وہ اپنے اچھے کاموں کی جزا نہایت فرحت اور خوشی سے دیکھیں گے۔ مگر اُنہیں یہ احساس نہیں ہوگا۔ کہ یہ خواب ہے۔ اس لئے وہ کوئی تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔ اُن کی آنکھ اس خواب سے حشر میں کھلے گی۔ جس کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

:: بیچ کے درجے کی جماعت کے آدمی مرنے کے بعد کی زندگی کا مطلب یہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ انسان کا اس بدن کے بجائے ایک روحانی وجود ہوگا۔ جس میں مادے ہی کے خواص پائے جائینگے۔ اور اُنہیں دُنیا کی زندگی سے زیادہ اچھی زندگی بسر کرنے کا موقع

لے گا۔ چونکہ وہ ایک درمیانے درجے کے لوگ ہیں۔ اس واسطے اُنہیں یہ یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اُونچے درجے کی زندگی کا دَور اس کے بعد شروع ہو گا۔ اور یہ منزل اُس زندگی کے لئے ایک مقدمہ ہے۔ یعنی اس کی ایک قسم کی تیاری ہے۔ جس طرح وہ دُنیاوی زندگی میں ایک مقصد حاصل کرنے کے لئے کام کرتے تھے۔ اسی طرح وہ اس قبر کی زندگی میں بھی اپنے شروع کئے ہوئے کاموں کے پُورا کرنے میں متوجہ رہینگے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ اُن کے پیچھے اُن کا کام ایک جماعت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس جماعت کی ہمّت افزائی کے لئے اُن سے جو کچھ بن پڑے گا وہ کر گزرینگے۔ (یعنی اُن کے پاس ایک معنوی جسم ہے جس سے وہ اسی طرح اثر ڈال سکتے ہیں۔ جیسے ایک مرشد کامل اپنی معنوی طاقت سے اپنے شاگردوں پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اپنے پیروؤں پر کچھ اثر ڈال سکتے ہیں) اور اُن سے اللہ تعالےٰ کی طرف جتنی توجّہ ممکن ہو گی اس میں یہی دُعا کریں گے۔ کہ اُن کے پیچھے چلنے والے کامیاب ہوں۔ موت کے بعد وہ جس عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ اُس کا یہ ایک بہت ہی مختصر سا خاکہ ہے۔

جو جماعت ان سے بھی اُونچے درجے کی ہے وہ جس طرح دُنیا میں اجتماعیت کا مرکز تھی۔ اسی طرح اُنہیں یہاں

(عالم برزخ) میں بھی اُن تمام انسانوں کی ایک طرح کی مرکزیت
حاصل رہے گی۔ جو برزخ میں زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ یہ
مرکزیت اجتماعی نہیں ہے۔ بلکہ انفرادی ہے۔ جیسے فوج کے
بہت سے افسر جب آخری جماعت میں تعلیم پا رہے ہوں، تو
اپنے دل میں اس قسم کا تصوّر بناتے ہیں۔ کہ وہ کسی دوست کی
مدد کے بغیر تمام فوجی نظام خود سرانجام دے دینگے۔ یعنی
وہ خود ہی مرکز بن جائیں گے۔ جب ان افسروں کو میدان میں کام
کرنا پڑے گا۔ تو ان میں انفرادیت نہیں رہے گی۔ وہ اپنے
ساتھ ایک جماعت کو مرکز میں لے آئینگے۔ یہ نہیں ہوگا کہ اکیلے
بیٹھ کر ایک قوّت کو چلائیں۔ مگر یہ اعلےٰ کام انہی سے بن پڑیگا۔
جنھوں نے کالج کی تعلیم کے زمانے میں تنہا اپنے لئے یہ پروگرام
تجویز کر لئے تھے۔ آگے چل کر یہ بات واضح ہو جائیگی کہ انسانیّت
کا اُونچا طبقہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ کر اللہ تعالےٰ کی قدرت اور
اللہ تعالیٰ کے علم کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک واسطہ بن جاتا ہے۔ یہ مرکزیت ہے
جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہے تو اس اعلیٰ جماعت کو موت کے بعد اس مرکزیّت کا ایک
دھندلا سا عکس نصیب ہوگا۔ وہ سمجھینگے کہ اس برزخ میں جتنی قدرت الٰہی کام کر رہی ہے
اس میں ہم ایک واسطہ ہیں۔ اور وہ اپنا کمال یہی سمجھینگے کہ اللہ تعالےٰ کے
سوا اُن کا کسی سے تعلق نہیں ہے جب وہ اس زندگی (برزخ) کو

ختم کرینگے۔ اور محشر کی زندگی شروع ہوگی۔ اُس کی مثال ایسی بن جائیگی جیسے اُنہوں نے کالج کو چھوڑ کر عمل کے میدان میں قدم رکھا۔ اُن کے لیے کوئی چیز غیر متوقع نہیں ہوگی۔ جتنا عرصہ وہ قبر میں رہینگے۔ وہ یقین رکھتے ہونگے کہ ہم اپنا کورس پُورا کر رہے ہیں۔ تو اُن کا یہ کورس حشر کے دن پُورا ہوگا۔ اُنہیں یقین ہے کہ جب حشر کا دن آجائیگا۔ وہ اس عالم سے نکل کر میدان میں آجائینگے۔ ان تبدیلیوں کا اُن کی نفسیات پر کوئی اثر نہیں پڑیگا (یعنی وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ پہلے دُنیاوی زندگی میں کچھ اَور ہو رہا تھا۔ اور پھر عالمِ برزخ میں کچھ اَور ہو رہا تھا۔ اور اب عالمِ محشر میں کچھ اَور ہو رہا ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھیں گے۔ کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ایک سلسلہ ہے جو ترتیب وار چلا جا رہا ہے) اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کسی آدمی کو مکمل پروگرام دے دیا گیا ہو۔ اور وہ اس پروگرام کے حصّے ایک دوسرے کے بعد باقاعدہ طور پر پورے کر رہا ہو +

یہ اعلیٰ طبقہ اپنے اندر ایک تقسیم رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک تو انتہائی چوٹی پر ہے۔ اور دوسرا اس کے ساتھ اس کے نیچے۔ یہ نچلے تھوڑی سی مُدّت کے بعد ان پہلوں سے مل جائیں گے۔ اور ان کی جگہ پر متوسط درجے کے لوگ آکر خانہ پُری

کر دینگے۔ یعنی عالم قبر کا جو نظام ہے وہ بھی نوع انسانی کی باقاعدہ ترقی کی ایک درمیانی کڑی ہے ؂

برزخ میں انسان کتنی قسم کے ہونگے۔ اُن کا شمار کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ لیکن ان کی بڑی قسمیں چار ہیں :-

(۱) اہل بیداری ان پر جو نعمتیں اور عذاب آتے ہیں۔ وہ ملکیت کی مناسب ہیئتوں یا مخالف ہیئتوں کا نام ہے [یعنی اُن کے اندر ملکیت کی ترقی سے جو کچھ کیفیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اُنہی سے اُنہیں لذت آتی ہے اور اگر وہ کیفیتیں پیدا نہیں ہوئیں تو اُنہیں تکلیف ہوتی ہے۔ اُنہیں سمجھانے کے لئے اُن کی حالت کسی دوسری شکل میں بدلنے کی ضرورت نہیں ہے] قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ "اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ" (یعنی انسان کہے گا۔ ہائے افسوس اُس پر جو مَیں نے اللہ تعالےٰ کے حکم کے ساتھ کوتاہی کی! اور مَیں اسی طرح پر مخول کرنے والے لوگوں میں سے تھا) [یعنی اُس نے جو کچھ دُنیا میں کمایا ہے۔ اُسے محسوس کر کے اُس کا نفس خود فیصلہ کرتا ہے کہ اُس نے بہت سی کوتاہی برتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے کام کو ایک طرح سے تمسخر کہنا جائز ہے۔ یہ آخری بیداری کی علامت ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو ٹھیک طرح پر محسوس کر رہا ہے] مَیں نے اللہ والوں کے ایک گروہ

کو دیکھا ہے۔ جس کی رُوحیں ایسی ہو گئی تھیں۔ جیسے ساکن پانی سے لبریز حوض جسے ہوا جنبش نہیں دیتی تھی۔ اور دوپہر کے وقت جب اُس پر سورج کی شعاعیں پڑیں تو وہ تمام حوض ایک نور کا قطعہ بن گیا۔ ان اللہ والوں کی رُوحوں میں جو نور چمک رہا تھا۔ وہ تین قسموں کا نظر آیا ہے۔

(۱) اچھے کاموں کا نور [اُنھوں نے اچھے کام کئے۔ اور اُن پر پکّی طرح قائم رہے۔ جس نے ایک نور پیدا کر دیا یہ عموماً سلیم الفطرت طبیعتوں میں ہوتا ہے۔ جنہیں ایک اچھا کام بتا دیا جائے۔ تو وہ اپنی طبیعت سے اُس کی خوبی پر یقین کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس میں کوتاہی کرنے پر راضی نہیں ہوتے] +

(ب) یادداشت کا نور [یہ لفظ صوفیائے نقشبندی طریقہ کی اصطلاح ہے۔ اس کی مختصر سی تفصیل یہ ہے۔ کہ انسان اپنی قلبی توجّہ کہ ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی طرف لگائے رکھتا ہے۔ اور اس میں سوتے جاگتے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ یہ عادت ایسی پکّی ہو جاتی ہے کہ وہ جب دوسرے کاموں میں لگ جاتا ہے۔ تو اس غفلت میں بھی وہ اللہ تعالےٰ کی طرف متوجّہ رہتا ہے۔ اس حالت کا نام ان کی اصطلاح میں "یادداشت کا نور" ہے۔ بعض ان لوگوں میں ایسی عادت بن جاتی ہے کہ وہ کام کوئی دوسرا کر رہے ہوتے

ہیں۔ مگر اُن کی توجّہ اللہ تعالےٰ کی طرف ہی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک عورت ہے جس نے دو گھڑے پانی بھر کر اپنے سر پر رکھ لئے۔ راستے میں اُسے دوسری عورت مل گئی۔ اور وہ اُس سے باتیں کرنے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اس حالت میں بھی اُس عورت کے دماغ میں ان گھڑوں کو سنبھالنے کی طرف خصوصی توجّہ قائم رہتی ہے]

(ج) رحمت کا نور [یعنی بعض انسان فطری طور پر اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ اُن سے اس طرح رحمت کا برتاؤ کیا جاتا ہے جیسے ماں باپ چھوٹے بچّوں سے کرتے ہیں۔ اُن میں کوئی بُرا خیال یا بُری توجّہ کا مادہ ہی نہیں ہوتا]

(۲) خوابیدہ جماعت | دوسری قسم پہلی جماعت کے ساتھ ملتی جلتی جماعت ہے۔ جسے ہم طبعی خوابیدہ جماعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ [ان لوگوں میں جاگرتی (بیداری) بالکل نہیں۔ یہ اپنے مَلکی کمالات کو براہِ راست محسوس نہیں کر سکتے۔ اُن پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے جسے خواب سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک شخص کو بیداری میں بھوک ستا رہی ہے۔ اور اُسے نیند آجاتی ہے تو وہ خواب میں دیکھتا ہے۔ کہ کوئی شخص اُسے روٹی کھلا رہا ہے۔ اور وہ کھا رہا ہے

یا وہ روٹی کی تلاش میں کہیں پھر رہا ہے۔ یہ درحقیقت بھوک کا وہی جذبہ تھا۔ جو بیداری میں اُسے ستا رہا تھا۔ وہی خواب میں اُسے پیش آیا۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اس درجے میں ہیں کہ بیداری میں اپنی بھوک کو محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی توجہ کسی دوسری جانب ہوتی ہے۔ مگر جب سو جاتے ہیں۔ تو انہیں اس طرح کے خواب کی شکل میں بھوک محسوس ہونے لگتی ہے۔ انہیں طبعی طور پر خواب والے آدمی کہا جاتا ہے] یہ لوگ ہیں جنہیں خواب آتے ہیں۔ خواب کی تحقیق یہ ہے کہ ہمارے دماغ [کے خزانۂ حس مشترک] میں جو علم محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمیں بیداری کی ہوشیاری اُن کی طرف توجہ کرنے سے روک رکھتی ہے۔ اور اس طرح ہم بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کے کوئی خیالات ہماری طبیعت میں موجود تھے۔ لیکن ہم جب سو جاتے ہیں تو اُن کی صورتیں ہمیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور جس وقت انسان غور کرتا ہے اُسے یقین ہوتا ہے۔ کہ یہ یقین اُنہی خیالات کی صورتیں ہیں۔ اور کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ طبیب لکھتے ہیں کہ جب خلطِ صفراء کا طبیعت پر غلبہ ہو تو اُسے ایسے خواب آتے ہیں جیسے گرمی کے دن خشک جنگل میں جا رہا ہو۔ اور گرم لُو چل رہی ہو۔ اچانک ہر طرف سے اُسے آگ نظر آنے لگتی ہے۔ اب وہ بھاگتا ہے لیکن کہیں پناہ کی جگہ نہیں پاتا۔

پھر اُسے آگ لپیٹ لیتی ہے۔ اور وہ اس سے بڑی تکلیف محسوس کرتا ہے (یہاں تک کہ اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے) +

اسی طرح ایک ایسا آدمی جس کے مزاج میں بلغم کا غلبہ ہے خواب میں دیکھتا ہے۔ کہ نہایت ٹھنڈی رات ہے اور ٹھنڈا پانی بہ رہا ہے۔ ہوا بھی نہایت ٹھنڈی چل رہی ہے۔ اُس کی کشتی کو موجوں نے اُونچے نیچے کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ وہ پانی میں غرق ہو گیا ہے اور اس وجہ سے اُسے بہت سخت تکلیف ہوتی ہے (اس کے بعد اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے) +

اگر آدمیوں کا حال اچھی طرح جانچا جائے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا۔ جسے کسی نہ کسی وقت اپنے نفس میں ایسی باتیں محسوس ہوئی ہوں۔ کہ جو خیالات اُس کے دل میں پختہ طور پر صورت پکڑ چکتے ہیں۔ وہی خواب میں ایک نعمت یا ایک تکلیف کی شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں [اور اس میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ صورتیں اُن ارادوں کے بھی مناسب ہوتی ہیں۔ اور اس دیکھنے والے انسان کی طبیعت سے بھی مناسبت رکھتی ہیں] برزخ میں ان لوگوں کی حالت ایک طرح کے خواب کی مانند ہے۔ مگر یہ خواب ایسا ہے جس سے قیامت سے پہلے (بیداری) نہیں ہوگی۔ اور خواب

دیکھنے والا انسان خواب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ یہ فقط خیالات ہیں۔ اور خاص واقعات نہیں ہیں۔ اور اس نعمت یا اس تکلیف کا انسانی وجود سے باہر کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر اس کے بعد [حشر کے دن] بیدار نہ ہو تو اسے یہ کبھی معلوم ہی نہ ہوگا۔ کہ وہ خواب کی حالت ہی میں تھا۔ اس لیے اس عالم کو ایک خارجی دُنیا ماننا یا کہنا زیادہ صحیح ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اُسے خواب کی دُنیا کہا جائے [یعنی عالمِ برزخ کا نام عالمِ رویا کی نسبت عالمِ خارجی ہونا زیادہ مناسب ہے] جس شخص میں پھاڑنے والے جانوروں (درندوں) کی خصلتیں زیادہ پیدا ہو چکی ہیں۔ [عالم برزخ میں] دیکھے گا۔ کہ اس پر ایک درندہ مسلّط ہے۔ جو اسے نوچ رہا ہے۔ اور جس کی طبیعت میں بخل زیادہ ہے۔ وہ اس عالم میں دیکھے گا کہ سانپ اور بچھو اُسے ڈس رہے ہیں۔ اور عالمِ برزخ میں اُس پر اُوپر کے عالم سے علم نازل ہونگے۔ وہ ایسے نظر آئینگے کہ وہ فرشتے ہیں۔ جو اسے پوچھ رہے ہیں "مَن رَّبُّكَ۔ مَا دِینُکَ وَمَا قَوْلُكَ فِي النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (یعنی تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور اس نبی کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟) [اس کے دل میں عالمِ بالا کے علوم سے تعلق تھا۔ اور یہ اپنے رب پر یقین رکھتا تھا۔ اور اپنے دین کو صحیح مانتا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلّم کو سچّا نبی جانتا تھا۔ اُوپر کے عالم کے نور سے منوّر ہو کر یہ عقیدے اسے منکر نکیر کی شکل میں نظر آئینگے۔ جو سوال کر رہے ہوں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ اُس کے دل میں یہ علم بہت پختہ ہے اور اس سے زیادہ کوئی بات نہیں، جیسے کسی آدمی کا خواب میں آگ دیکھنا اس بات کا ثبوت تھا کہ اُس کے بدن میں صفراء غالب آچکا ہے۔ ایسے ہی ایک مومن کا ان فرشتوں کو دیکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں عقیدے بہت پختہ طور پر جگہ پکڑے ہوئے ہیں]

(۳) کمزور لوگ | تیسری قسم اُن لوگوں کی ہے جن کی بہیمیّت اور ملکیّت دونوں ضعیف ہیں۔ وہ عالم برزخ میں جا کر نچلے درجے کے فرشتوں سے مل جاتے ہیں۔ اس کے اسباب کبھی پیدائشی ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح پر کہ ان کی ملکیّت بہیمیّت میں زیادہ ڈوبی ہوئی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو بہیمیّت کے زیادہ حکم مانتے ہیں۔ اور نہ اس سے زیادہ اثر لیتے ہیں۔ کبھی یہ اسباب تعلیم و تربیت کیساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح پر کہ اگر اُسے دلی شوق سے پاک صاف رہنے کا زیادہ پکا خیال رکھا ہے اور اپنے نفس میں ایسی طاقت پیدا کرتا رہا ہے [یعنی ذکر و فکر میں لگا رہا ہے] جس سے الہام اور فرشتوں کے نور سے فائدہ اُٹھا سکے۔ اس حالت میں بھی یہ نچلے درجے کے فرشتوں سے مل جاتا ہے [ایسے انسان

دیکھے جاتے ہیں۔ جن میں کوئی بڑا ہمت کا کام کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ لیکن وہ وضو اور غسل وغیرہ میں بہت احتیاط سے لگے رہتے ہیں۔ اور فرض نماز پڑھنے کے بعد نوافل اور ذکر نہایت بھلی طرح سے کرتے ہیں۔ آگے چل کر ان لوگوں کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے] اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے بعض انسان بعض اوقات مردوں کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ان کے مزاج میں زنانہ پن کی جانب میلان ہوتا ہے وہ عورتوں کی حالتوں کو بہت شوق سے پسند کرتے ہیں۔ لیکن بچپن میں وہ مردوں عورتوں کی جنسی خواہشوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بچپن کا زمانہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ جس میں کھانے پینے اور کھیل کود کے سوائے اور کوئی چیز بچوں کو پسند نہیں آتی۔ اگر انہیں حکم دیا جائے کہ وہ مردوں کا لباس اختیار کریں۔ اور عورتوں کی عادتوں سے بچیں تو وہ اس حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی پوشیدہ طبیعت کے اثرات سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اب وہ یکلخت عورتوں کی وضع اختیار کر لیتے ہیں۔ اور انہی کی سی عادتوں کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اور مرض صدومت (SODOMY) میں پھنس جاتے ہیں۔ اور جو عورتوں کے کام ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں ہر گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنا نام بھی عورتوں کا سا رکھتے ہیں (وہ اگرچہ بچپن میں ایک زمانہ تک مردانہ صورت میں رہ چکے ہیں)

کلمہ) اب وہ مردوں کی جنس سے بالکل کٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان دُنیاوی زندگی میں کھانے پینے اور شہوتِ جنسی اور دوسرے طبعی تقاضوں میں یا برادری کی رسموں میں مصروف رہتا ہے (اُسے اس کا بچپن سمجھنا چاہیے) لیکن وہ نچلے درجے کے فرشتوں کی حالت کے قریب ہوا کرتا ہے۔ ان کی کشش اُس میں زور کی ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ مر جاتا ہے۔ تو بہیمیّت کے تمام تعلق کٹ جاتے ہیں اور یہ اپنے اصلی مزاج کی طرف لوٹ آتا ہے [جیسے وہ مخنث جوانی میں عورت بن جاتا ہے] اس کے بعد وہ شخص فرشتوں سے جا ملتا ہے۔ اور اُنہی میں سے ہو جاتا ہے۔ اور انہی کی طرح اسے بھی الہام ہونے لگتا ہے۔ اور جس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں۔ اسی کام میں یہ بھی سرگرم رہتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ "میں نے جعفر طیارؓ[1] کو ایک فرشتے کی صورت میں دو پروں کے ساتھ فرشتوں کے گروہ میں اڑتے ہوئے دیکھا" [یہ ایک معرکہ میں کفّار کے مقابلے میں شہید ہو گئے تھے۔ اور اُن کے دونوں ہاتھ جنگ میں کٹ گئے تھے۔ مگر اُنہوں نے ہاتھ کٹ جانے کے بعد بھی لڑائی جاری رکھی۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ نے اُنہیں

---

[1] حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ کے بھائی (مرتّب)

دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کی بجائے دو پر عطا کر دیئے] ۔
بعض اوقات یہ لوگ دینِ الٰہی کی شان بلند کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اللہ والے جو کام کرتے ہیں یہ اُن کے مددگار بن جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ انسان کے دل میں اچھے خیال ڈالنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ انسانی جسم کے بہت مشتاق ہوتے ہیں۔ وہ ان کی جبلّت کا تقاضا ہوتا ہے۔ تو یہ شدید خواہش عالمِ مثال میں تاثیر کرتی ہے۔ اور مثالی قوّت ان کے نسمۂ ہوائی میں مل جُل جاتی ہے۔ اور (ان کی اصلی صورت کے مطابق) ایک نورانی جسم انہیں مل جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ان میں سے بعض لوگ کھانے پینے کے مشتاق نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے عالمِ مثال کی قوّت سے انہیں مدد دی جاتی ہے۔ (یعنی جیسا کھانا کھانا چاہتے ہیں انہیں عالمِ مثال سے ویسا ہی کھانا ملتا ہے) چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ "ولا تحسبین الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہ" (یعنی ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے مُردہ مت خیال کرو۔ بلکہ وہ اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں۔ انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ تعالےٰ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اس میں وہ بہت

خوش ہیں) +

ان لوگوں کے مقابلے میں ایک ایسی جماعت ہے کہ وہ شیطانوں سے وہی نسبت رکھتے ہیں۔ جیسی ان کی ملائکہ سے تھی یہ نسبت یا تو اُن کی جبلّت کا تقاضا ہوتی ہے (یعنی پیدائشی ہوتی ہے) اس لئے کہ اُن کا مزاج بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ جس سے حق کے مخالف فکر پیدا ہوتے ہیں۔ سوسائیٹی کی عام مصلحت کے پُورے پُورے خلاف خیالات اُن کے بگڑے ہوئے مزاج کا طبعی تقاضا ہوتا ہے اور اچھے اخلاق سے بہت دُور ہوتے ہیں۔ یا یہ نسبت اُنہیں اس لئے حاصل ہوتی ہے۔ کہ اُنہوں نے اپنی کوشش سے گندی حالتیں اور بُرے خیالات حاصل کئے ہوئے ہیں۔ اور شیطانی خیالات پر جو ان کے دلوں میں ہیں جھٹ پٹ عمل پیرا ہونے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دُور ہوتے ہیں چنانچہ جب وہ اِس زندگی سے گزر کر اُس زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ شیطانی قوتوں سے مل جاتے ہیں۔ اُنہیں ایک سیاہ لباس دے دیا جاتا ہے۔ اور ان کے لئے ایسی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں جن سے یہ اپنی کمینی عادتوں کا شوق پورا کرتے رہیں۔ جو لوگ فرشتوں سے جا ملتے ہیں وہ اپنے نفس کے احساسِ مسرّت سے انعام الہی پاتے ہیں۔ اور جو لوگ شیطانوں کے ساتھ جا ملتے ہیں وہ اپنے آپ کو تنگی اور

مصیبت میں پاتے ہیں۔ یہ اُن کے لئے ایک عذاب ہوتا ہے۔ اور وہ اسے خوب سمجھتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے مخنّث جو خوب جانتا ہے۔ کہ زنانہ پن انسان کے حالات میں نہایت بدترین حالت ہے۔ لیکن وہ اپنی طبیعت سے اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

(۴) اہلِ اصطلاح | چوتھی قسم اہلِ اصطلاح کی ہے۔ جن کی بہیمیّت زور کی اور غالب ہوتی ہے۔ مگر ملکیّت کمزور ہوتی ہے۔ زیادہ تر انسان اسی طبقے کے ہوتے ہیں۔ اُن کے اکثر کام اس حیوانی صورت کے تابع ہوتے ہیں۔ جو بدن میں تصرف کرتی ہے۔ اور وہ بہیمیّت کی خواہشوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ اُن کی موت ان کی روحوں کو بدن سے پُورے طور پر کاٹ نہیں دیتی۔ بلکہ فقط یہ ہوتا ہے کہ ان کی رُوحیں ان کے بدنوں سے کام نہیں لے سکتیں۔ مگر ان کے خیال میں اُن کا بدن اُن کے ساتھ ہوتا ہے[۱]۔ چنانچہ اُن کے دل میں اس بات کا کہ اُن کا بدن موجود ہے۔ ایسا یقین ہوتا ہے۔ کہ اس کے خلاف اُنہیں وہم بھی نہیں گزرتا یہاں تک کہ اگر وہ دیکھیں کہ اُن کے بدن کو کوئی پائمال کر رہا ہے یا اُس

---

[۱] راقم الحروف کی والدہ کا ایک بازو جسے کوئی درد دینے والی بیماری ہو گئی تھی کاٹنا پڑا۔ اس کے بعد پندرہ بیس سال تک وہ یہی محسوس کرتی رہیں کہ بازو موجود ہے اور اس میں فلاں جگہ سے درد شروع ہو کر فلاں طرف کو جا رہا ہے (مرتّب)

کا کوئی حصہ کاٹ رہا ہے تو وہ یقین کرتے ہیں کہ واقعی یہ معاملہ اُن کے بدنوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور ان کی علامت یہ ہے۔ کہ وہ اپنے دل کے یقین سے کہتے ہیں۔ کہ ان کی روحیں اور اُن کا بدن ایک ہی چیز ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہاں تک ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اُن کی رُوح ایک عرض ہے۔ جو بدن سے لگا ہوا ہے +

[عرض اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنا الگ وجود نہ رکھتی ہو۔ بلکہ کسی دوسرے وجود کے ساتھ لگ کر رہے۔ جیسے رنگ علیحدہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ کسی دوسری چیز کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ پس رنگ کو عرض کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اپنی رُوح کو بدن کا ایک رنگ سمجھتے ہیں۔ یہ بات اُن کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتی کہ رُوح بدن سے علیحدہ ایک مستقل ہستی ہے] +

ایسے لوگوں کی علامت یہ بھی ہے۔ کہ گو وہ تقلید یا رسم کی وجہ سے اپنی زبانوں سے قائل نہ ہوں۔ لیکن وہ خاص دلی حالت سے اس کے قائل ہوتے ہیں۔ کہ ان کی رُوحیں اور بدن ایک ہی شے ہیں۔ یا رُوحیں ایک عارضی شے ہیں جو بدنوں پر طاری ہو جاتی ہیں۔ [یعنی اگرچہ زبانی طور پر لوگوں کی موافقت میں کہتے رہینگے۔ کہ روح ایک مستقل چیز ہے۔ لیکن بات سوچ کر نہیں کہتے] یہ لوگ جس وقت مریں گے۔ اُن پر ملکیّت کی ایک دھیمی سی روشنی پڑے گی۔ اور اُن کے خیال میں

ایک ہلکی سی ترقی ہوگی۔ جیسے یہاں ریاضت کرنے والوں کو کمزور سا خیال نظر آتا ہے۔ ایسے ہی اُنہیں بھی نظر آئیگا۔ اُنہیں کبھی خیالی شکلوں میں امور نظر آئینگے۔ اور کبھی عالم مثال کی خارجی شکلوں میں دکھائی دینگے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہاں ریاضت کش لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ [ذکر اور فکر کی ریاضت کرنے والے آدمی کبھی تو یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے اندر سے ایک نُور چمکا۔ اور کبھی دیکھتے ہیں کہ باہر سے مقدس شکل نظر آئی۔ اور اُس نے باتیں کیں۔ اور یہ اُن کی دُنیا میں انتہائی ترقی ہوتی ہے۔ اس چوتھی قسم کے لوگوں کو یہ حالت موت کے بعد خود بخود حاصل ہو جاتی ہے] اگر ان لوگوں نے ملکیت کے مطابق اعمال کئے ہیں۔ تو ان سے اچھے معاملے کا علم صورتوں اور شکلوں میں انہیں دکھایا جائیگا جیسے خوبصورت فرشتے ہونگے جن کے ہاتھوں میں ریشم کے کپڑے ہونگے۔ وہ اُن سے عزت سے بات کرینگے۔ اور انہیں یہ فرشتے خوشی دینے والی حالتوں میں نظر آئینگے۔ اُن کے لئے جنت کا دروازہ کھول دیا جائیگا۔ وہاں سے اُنہیں خوشبو آنے لگے گی۔ اور اگر اُنھوں نے ملکیت کے خلاف کام کئے ہوں یا ایسے کام کئے ہوں جن کے سبب سے وہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے دُور ہو گئے۔ تو یہ انسانی تقاضوں کی مخالفت کا علم انہیں خاص صورتوں میں دکھایا جائیگا۔ جیسے یہ منظر کہ فرشتے ہونگے جن کی بات

کرنے کا طریقہ نہایت سخت ہوگا۔ اور حالت نہایت مکروہ ہوگی۔ ان فرشتوں کی مثال ایسی ہے۔ جیسے غضب کا جذبہ درندے کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ اور بزدلی خرگوش کی شکل میں [اسی طرح وہ فرشتے ان کے اعمال کے مناسب صورتوں میں اُن سے نہایت ہی بُرا معاملہ کریں گے]

قبر کی دُنیا اور حشر کی دُنیا کا فرق عالمِ برزخ میں ایسے فرشتے بھی ہیں جن کی استعداد کا یہ تقاضا ہے۔ کہ وہ اس عالم پر موکّل بنا دیئے جائیں۔ اگر کسی کو عذاب دینا ہو یا اس پر نعمت بھیجنی ہو۔ تو اُنہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ تو وہ لوگ جو یہاں عالمِ برزخ میں پہنچتے ہیں۔ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ دُنیا کے لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ یہ برزخ کی زندگی یا عالمِ قبر [مستقل زندگی کی ابتدا نہیں ہے بلکہ] اس عالمِ دُنیا ہی کی زندگی کا بقیہ ہے فقط اتنا فرق ہے۔ کہ دُنیا میں معلومات پردے کے اندر سے حاصل ہوتی تھیں [اور یہاں بغیر حجاب کے نظر آتے ہیں]

اس عالمِ برزخ میں انسانی روحوں کے وہی احکام ظاہر ہوتے ہیں۔ جو ایک ایک فرد سے الگ الگ تعلق رکھتے ہیں [اوپر کی مثال میں اسے نکاح کرنے تک کی زندگی کے مشابہ بتایا تھا] اور عالمِ حشر

میں جس قدر باتیں ظاہر ہوں گی۔ وہ سب انسان کی نوعی صورت کے مناسب حال ہونگی [جو بحیثیت مجموعی تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاص خاص انسانوں کا حکم وہاں کبھی زیر غور نہیں ہوگا یعنی وُہ انفرادی درجہ یہیں قبر میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد جس قدر ترقی ہوگی وہ اجتماعی ترقی ہوگی۔ پہلے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے لوگ آپس میں جمع ہونگے۔ پھر ان چھوٹی جماعتوں سے بیچ کے درجے کی جماعتیں پیدا ہونگی۔ پھر بیچ کے درجے کی جماعتوں سے بڑی بڑی جماعتیں بنیں گی پھر ان سے انسانیت کا ایک مجموعہ تیار ہوگا۔] باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

سترھواں باب

حشر کے واقعات

سترھواں باب (۱۷)

حشر کے واقعات

جس طرح پانی کے قطرے مینہ کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پانی کی دھار بن جاتے ہیں پھر آگے چل کر چھوٹی چھوٹی ندیاں بن جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دریا بن جاتا ہے۔ پھر چند دریاؤں سے مل کر ایک بہت بڑا دریا بن جاتا ہے۔ اس کے قریب قریب انسانی روح کی مثال ہے جو اپنی اندرونی خاصیتوں کے مطابق جس جز سے زیادہ قریب ہوتی ہے مرنے کے بعد اُس سے

مل جاتی ہے۔ یہ ان میں آپس کے قدرتی جذب یعنی کشش کے سبب سے ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ وہ فرد آگے چل کر دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے فرد سے ملنا شروع ہوتے ہیں اسی طرح ایک درجے کی صفتوں والے انسان کی ایک لمبی صف بن جاتی ہے۔ جس میں وہ اپنے قدرتی نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً جس میں ۱۰۰ فیصدی قوت ہے وہ سب سے آگے ہے۔ جس میں اس سے ایک درجہ کم ہے یعنی ۹۹ فیصدی ہے وہ اس کے پیچھے اور اس کے بعد اس سے کم یعنی ۹۸ فیصدی والا اس کے بعد ایک کم یعنی ۹۷ فیصدی والا۔ اسی طرح ایک نمبر کم ہوتے ہوتے ایک صف بن جاتی ہے۔ پھر اس صف میں ایک نئی چیز نمایاں ہونے لگتی ہے۔ جب تک افراد کام کرتے تھے۔ ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ اُس کے سب کام اُس کی شخصی قوت سے پیدا ہوتے ہیں اس صف میں شامل ہونے کے بعد ان کی شخصی قوتیں چھپنے لگتی ہیں۔ اور اُن کی سانجھی صفت جو تمام میں یکساں پائی جاتی ہے ظاہر ہونے لگتی ہے۔

اس طرح کے احکام کے ظاہر ہونے اور چھپنے کی ایک مثال دی جاتی ہے۔

پانی میں طبعی طور پر ٹھنڈک پائی جاتی ہے۔ پانی آگ پر رکھنے سے عارضی طور پر گرم ہو جاتا ہے۔ جس وقت پانی کی حرارت کھولنے کے قریب ہو جائے۔ اس وقت اس میں کوئی ہاتھ ڈالے تو پانی اُس کا ہاتھ جلا دیگا۔ یعنی اس وقت وہ آگ کا کام کرتا ہے۔ اُس کی ٹھنڈک جو طبعی تھی۔ وہ اس وقت چھپ چکی ہے اور گرمی جو اسے عارضی طور پر حاصل ہوئی ہے۔ وہ نمایاں ہو گئی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے بھی اس حالت میں کہ یہ کھولتا ہوا پانی بدن کو جلا رہا ہے۔ اگر اسے جلتی آگ پر ڈالا جائے تو وہ آگ کو بجھا دے گا۔ یعنی پانی میں طبعی ٹھنڈک موجود ہے۔ جس سے وہ آگ کو بجھا رہا ہے۔ مگر اس پر گرمی اس قدر غالب آگئی ہے۔ کہ اگر اس میں ہاتھ ڈالا جائے تو وہ اُسے جلا دیتا ہے +

اسی طرح اس صف میں انسانیت کی طبعی خاصیتیں نمایاں ہو جائیں گی۔ اور عارضی باتیں چھپ جائیں گی۔ پانی میں طبعی خاصہ چھپا ہوا تھا۔ اور عارضی گرمی ظاہر تھی۔ یہاں بھی یہی حال ہے کہ انسان کی انسانیت اس دنیا میں پوشیدہ (Dormant) ہے۔ اور اس کی انفرادیت ظاہر ہے۔ مرنے کے بعد اس کی طبعی انسانیت نمایاں ہونے لگے گی۔ اور اس کی انفرادیت (Individualism) کے آثار گم ہونے لگیں گے +

جس طرح ایک صف پیدا ہوئی۔ اُسی طرح تھوڑے تھوڑے

فرق سے انسانیّت کی بے انتہا صفیں افراد سے بن جائینگی ہم نے اگر پہلی صف میں ملکیّت کو ۵۰ نمبر دیئے۔ اور اسی طرح بہیمیّت کو پچاس نمبر دیئے۔ تو ایک ایک نمبر کی کمی زیادتی سے بہت ہی صفیں بن جائینگی۔ اور ہر صف کو اسی طرح دوسری صف سے مل کر اپنے نمبر پر رہنا ہوگا۔ جس طرح افراد اس صف میں مرتب ہوئے ہیں۔ یعنی جس صف میں سب سے زیادہ ملکیّت پائی جاتی ہے۔ وہ سب سے زیادہ اونچی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ جس صف میں ایک نمبر کم ملکیت ہوگی وہ اس کے قریب ہوگی۔ اسی طرح نمبروار صفیں مرتب ہوتی چلی جائینگی۔ ان صفوں کے ملنے کے بعد اصلی انسانیّت نمایاں ہو جائیگی۔ ہر ایک شخص کی شخصیت اور پھر ہر ایک صف کی شخصیت چھپی ہوئی ہوگی۔ یہ انسانیّت عالمِ مثال کے جس طبقے سے تقسیم ہوئی ہے۔ وہاں اس کا پورا خزانہ محفوظ ہے۔ اُس مقام کا نام حظیرۃ القدس ہے۔ اس نوع انسانی کو جو اب حشر میں مرتب ہوئی ہے۔ اپنے اصلی مخزن کی طرف طبعی کشش ہوگی۔ اور اس کشش سے جو اثر ان صفوں اور ان شخصیتوں پر پیدا ہونگے [یعنی ان کے اندر جو محفوظ قوتیں ہیں۔ اور جو قبر کے زمانہ میں ایک طرح مہذب ہو چکی ہیں] اب نئی شکل میں ظاہر ہونے لگینگی۔

اس بات کو سمجھ لینا کہ اس تبدیلی کے اندر کونسی قوت کام کر رہی ہے۔ یہی حشر کے واقعات کی تفسیر اور حکمت ہے

"روحِ اعظم" | یاد رکھنا چاہئے کہ انسانی رُوحوں کے لئے عالمِ مثال میں ایک ایسی جگہ (Pole) ہے جس کی طرف یہ رُوحیں اسی طرح کھنچ کر جاتی ہیں جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ اس جگہ کا نام "حظیرۃ القدس" ہے۔ یہ اُن سب انسانی روحوں کے جمع ہونے کا مقام ہے۔ جو جسم کے لباس سے الگ ہو جاتی ہیں۔ اور اس مجمع کا مرکز "روحِ اعظم" ہے۔ جس کی تعریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مُنہوں اور بہت سی زبانوں اور بہت سی بولیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ "رُوحِ اعظم" حقیقت میں عالمِ مثال کے آئینے میں مکمل نوعِ انسانی کی ایک عکسی تصویر ہے۔ اور اس عالم کو کہیں کہیں "ذِکر" کے لفظ سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ [عالمِ مثال حکما کی اصطلاح ہے۔ اور "ذِکر" اللہ تعالےٰ کی طرف سے آنے والی شریعتوں کا کلمہ ہے] اس جگہ پر جتنی رُوحیں جمع ہوتی ہیں۔ اُن کے وہ تمام "احکام" (Attributes) جو انفرادی خصوصیتوں (Characteristics)۔ سے پیدا ہوتے تھے۔ وہ قطعی طور پر فنا ہو جاتے ہیں [یہاں "فنا" سے ان احکام کا "چھپنا" (Dormancy) مراد ہے۔ اُن کی ہستی

کا گم ہو جانا مراد نہیں ہے۔ جس طرح طبیعی حکیم (Physicist) بہت بڑی تحقیق کے بعد اس نقطے پر پہنچے ہیں کہ مادے کا ایک ذرّہ بھی کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ بالکل ذرّات مٹ کر قوّت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح رُوحانی حکما (Psychists) کی رائے ہے۔ کہ انسانیّت کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہیں ہوتا بلکہ رفتہ رفتہ ایک ایک ذرّے کی شخصیّت رُوحِ اعظم کی اجتماعیّت میں مل جاتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد اُن کے الفاظ کی شرح کرنی آسان ہے] اور جو احکام نوع سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا ایسے احکام جن میں نوع کی حالت غالب ہوتی ہے [اور فردیت کی جبلّت مغلوب ہوتی ہے] فقط وہی احکام انسانی رُوح پر اُس موقع میں پائے جاتے ہیں +

اس بات کو کھول کر بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر بھی انسانی افراد ہیں۔ اُن میں بعض باتیں تو ایسی ہیں۔ جن کے سبب سے وہ ایک دوسرے سے الگ الگ معلوم ہوتے ہیں۔ اور بعض باتیں ایسی ہیں۔ جو سب میں ایک جیسی پائی جاتی ہیں۔ اور جن میں وہ سب برابر کے ساجھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام (جن میں تمام شریک ہوتے ہیں) نوع کی طرف منسوب ہونے چاہئیں (ان نوعی احکام کو "فطرۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے) اسی کی طرف رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی

اس حدیث میں اشارہ ہے۔ "کل مولودٍ یولدِ علی الفطرۃ"
(یعنی ہر ایک بچہ انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے) [آگے چل کر اس کے ماں باپ اسے یہودی نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں]۔

ہر ایک نوع کے لئے احکام | ہر ایک نوع کے لئے دو قسم کے احکام (Characteristics) خاص ہوتے ہیں :-

(۱) ظاہری | ظاہری احکام (External Characteristics)
جیسے رنگ۔ شکل۔ مقدار اور آواز وغیرہ کسی نوع کے ہر ایک فرد میں اپنی نوع کے سب کی سب خاصیتیں ضرور پائی جائیں گی۔ شرط یہ ہے کہ اُس کی ساخت کے مادے میں کوئی صاف صاف نقصان نہ ہو۔ جس سے وہ نوعی احکام پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ چنانچہ انسان وہ نوع ہے جس کا قد سیدھا ہوتا ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر کلام کرتا ہے۔ اس کا چمڑا بالوں سے ڈھکا ہوا نہیں ہوتا۔ اور گھوڑا وہ نوع ہے جس کا قد ٹیڑھا ہوتا ہے۔ وہ ہنہناتا ہے۔ اور اُس کی کھال پر بال ہوتے ہیں۔ اس طرح کی ظاہری خاصیتوں سے نوع کا کوئی فرد خالی نہیں ہوتا۔ یہ نوع کے ظاہری احکام ہیں۔

(۲) باطنی | باطنی احکام (Internal Characteristics)
جیسے سمجھنا (ادراک) اپنی معاش تلاش کرنے کا اپنے اندر سے الہام ظاہر کرنا۔ اور جو مصیبتیں باہر سے آنے والی ہیں۔ اُن کے مقابلے کی تیاری

کرنا ان باطنی احکام کے متعلق) ہر ایک نوع کا ایک خاص قانون ہے۔ جسے اس نوع کی شریعت کہنا چاہیئے۔ چنانچہ شہد کی مکھی کو دیکھئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے کیسے وحی کی کہ وہ درختوں کی تلاش کر کے اُن کے پھلوں سے رس چوسے۔ اور پھر وہ کیسے چھتّہ بنائے۔ جس میں اُس کی جنس کے افراد (مکھیاں) جمع ہو سکیں۔ پھر کیسے وہاں شہد جمع کرے۔ اسی طرح چڑیا کو وحی کی کہ اُس کا نر اپنی مادہ کے ساتھ محبّت کرے۔ پھر دونوں مل کر گھونسلا بنائیں۔ انڈے سیئیں پھر بچّے نکالیں۔ اور جب بچّے چُگنے کے قابل ہو جائیں اُنہیں بتائیں کہ پانی کہاں ہے اور دانہ کہاں ہے؟ اور اُنہیں دوست اور دشمن کی تمیز سکھائیں۔ اور اُنہیں سمجھائیں کہ بلّی اور شکاری سے کس طرح بھاگنا چاہیئے۔ اور جب اپنے کسی ہم جنس سے نفع اور نقصان میں جھگڑا ہو۔ تو اُسے کیسے نپٹانا چاہیئے [ان معنوی احکام . . . . میں ہر نوع کے تمام افراد ایک ہی سا تقاضا رکھتے ہیں] کیا کوئی سلیم الطبع انسان ان احکام پر غور کرنے کے بعد یہ خیال کر سکتا ہے۔ کہ یہ صورت نوعیہ کا تقاضا نہیں ہیں؟

فرد کی "سعادت" | یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ ہر فرد کی سعادت (بہتری) اس میں ہے کہ اس میں نوع کے تقاضے پورے کے پورے

ظاہر ہوں اور اُس کے مادے میں ایسی کمی نہ ہو کہ نوع کے بعض خواص ظاہر نہ ہو سکیں۔ اسی اعتبار سے ہر نوع کے افراد میں سعادت اور شقاوت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جو چیز نوع کے تقاضے پر جس قدر پوری ہو گی۔ اُسے کبھی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ تکلیف کا نہ پہنچنا ہی اُس کی سعادت ہے۔[اس کا جو جی چاہتا ہے، اُسے پورا ملتا ہے۔ اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے] لیکن ہر فرد میں فطرت پورے طور پر ظاہر نہیں ہوتی۔ کبھی ایسے اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں جو اسے فطری تقاضے سے ہٹا دیتے ہیں۔ جیسے انسانی بدن میں سُوجن پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مذکورہ بالا حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے جس میں [آگے چل کر] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ ثم ابواہ یھوّدانہ او ینصّرانہ او یمجسانہٗ (یعنی بچے کو اس کے ماں باپ اپنے خاص طریقہ میں رنگتے ہیں۔ اور اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں) [یعنی ابتدائی تربیت میں بچّہ اپنے ماں باپ سے کچھ سیکھ لیتا ہے۔ ماں باپ اُسے نوع کے صحیح احکام اور اعلیٰ فطرت سکھاتے ہیں۔ تو وہ طبعی تقاضے سے وہ صحیح احکام لے لیتا ہے۔ لیکن جب وہ اس میں غلط باتیں ملاتے ہیں تو بچّہ رد نہیں کر سکتا۔ وہ ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے مانتا چلا جاتا ہے۔ اور اسی سے اُس

کی فطرت بگڑ جاتی ہے] ؛

رُوحوں کی کشش خطیرۃ القدس کی طرف انسانی روحوں کا نوعی حیثیت سے حظیرۃ القدس کی طرف کھنچنا دو طرح پر ہوتا ہے :-

(۱) پہلی وہ کشش ہے۔ جس میں بصیرت اور ہمت کو بہت دخل ہے [یعنی انسان اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھتا ہے۔ اور ارادہ کرتا ہے۔ کہ وہاں پہنچے۔ اس کی قوتِ ارادی اس طبعی کشش کے لئے مواد بن جاتی ہے۔ اس کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ] جس انسان کا نفس بہیمیت کی نجاستوں سے پاک ہوگا۔ ضرور ہے کہ اُس کا نفس حظیرۃ القدس میں پہنچ جائے گا۔ اور وہاں کی بعض چیزیں اُسے نظر آنے لگینگی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "اجتمع آدم وموسیٰ عند ربھما۔" (آدمؑ اور موسیٰؑ اپنے رب کے ہاں جمع ہوئے) [جمع ہونے کا محل حظیرۃ القدس ہی ہے] (ایک ضعیف) روایت میں رسول اللہ صلعم سے منقول ہے اگرچہ اس کی اسناد کثرت سے ہیں "اِنّ ارواح الصالحین تجتمع عند الروح الاعظم" (یعنی صالحین کی روحیں روح اعظم کے پاس جمع ہوتی ہیں) [اس قسم کی جتنی احادیث ہیں۔ انہیں محقق محدث صحیح نہیں مانتے۔ ان کی یہ رائے ہے۔ کہ دوسری صدی کے شروع میں عام طور پر اور پہلی صدی میں کہیں کہیں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جن کے قلب میں غیب کی قوت

ہے۔ اور وہ غیب کی چیزوں کو کشف کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے جملے درحقیقت اُن بزرگوں کے مقولے ہیں۔ اور کمزور حافظے والے راویوں نے ان کو رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیا۔ ان مسائل پر اس طرح جرح نہیں کی جاتی کہ جو کچھ اس قسم کی روایات میں ذکر ہے۔ یہ غلط ہے۔ یا واقع میں صحیح ہے؟ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ ان روایات کی نسبت رسول اللہ صلعم کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ پچھلے طبقے میں ایسے فقیہہ اور صوفی کثرت سے پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ایسی ضعیف روایات کو جو ان کی رائے اور کشف کے مطابق تھیں قبول کر لیا۔ اور محدثین کے فیصلے کی کوئی پروا نہیں کی۔ حدیث زیر بحث بھی اسی قسم کی ہے۔ اس کتاب کا مُصنّف (شاہ ولی اللہ) علمِ حدیث کا بھی امام ہے۔ اس واسطے وہ تصریح کر رہا ہے۔ کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور صاحبِ کشف جتنے بڑے ائمہ ہیں اُنھوں نے چونکہ اسے قبول کر لیا ہے۔ تو اُن کے متبعین پر حجت کرنے کے لئے اسے ذکر کر رہا ہے۔ اور یہ بھی اتفاقی بات ہے۔ کہ خود مصنّف (شاہ ولی اللہ) کا کشف بھی اس حدیث کے موافق ہے]۔

(۲) انسانی ارواح کا نوعی حقیقت سے حظیرۃ القدس کی طرف کشش کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تکلیف یا راحت کے ذریعے

سے بصیرت اور ہمت کے آثار صورت پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس کا قاعدہ سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ دوسری دفعہ بدن کا پیدا کرنا اور روح کا اس میں آنا۔ نئی زندگی نہیں ہے بلکہ یہ دنیاوی زندگی ہی کا تتمہ ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے۔ جیسے زیادہ کھانے سے بدہضمی ہو جائے۔ یہ نئی زندگی کوئی شخص کیسے تصور کر سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ جو پیدا ہوئے۔ یہ وہ نہیں ہیں جو مر چکے ہیں۔ تو انہیں ان پہلوں کے کام پر جواب طلبی کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اب اگر حشر میں پیدا ہونے والے واقعات پہلی زندگی کی اعمال کی ایسی صورتیں ہیں۔ جیسے ایک جذبہ خواب میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک انسانی خواہش خواب میں ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ تو یہ کوئی تردد کا محل نہیں ہے۔ یعنی اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن حشر کے واقعات خواب کا درجہ نہیں رکھتے۔ اس لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بہت سی چیزیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں ان میں ایک خاص معنی کو مناسب اجسام میں صورت دینا منظور ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ بھی خواب کی مثال بن جاتی ہے۔ اس کی چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں:۔

(۱) حضرت داؤد علیہ السلام کے روبرو دو فرشتے مدعی اور مدعا علیہ

کی حیثیت میں ظاہر ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے جھگڑوں کے متعلق فیصلہ چاہا۔ اِس خارجی واقعے کو دیکھ کر داؤد علیہ السّلام یہ سمجھے کہ یہ صورت میری اُس غلطی کی ہے۔ جو اوریا کی بیوی کے متعلق مجھ سے صادر ہوئی۔[لہ] اس کے بعد انہوں نے بخشش مانگی۔ اور توبہ کی +

(۲) معراج کی رات رسول کریم صلعم کے سامنے دو پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ پسند فرمایا۔ یہ واقعہ اس بات کی تصویر تھا۔ کہ رسول اللہ صلعم کی اُمّت کے سامنے شہوتیں اور فطرتی ترقی کے راستے دونوں پیش ہوں گے۔ اور جو رسول اللہ صلعم کے پورے تابع ہیں۔ وہ شہوت پرستی چھوڑ کر فطرت کا صحیح راستہ اختیار کریں گے +

[لہ] اوریا کے متعلق مشہور قصّہ ہے۔ اور غلط ہے۔ مگر اس قصّے کے بدنما حصّے کو حذف کرنے کے بعد مصنّف (شاہ ولی اللہ) اسے ایک حد تک صحیح مانتے ہیں اور تاویل الاحادیث میں اس کی حقیقت پر مفصّل بحث کی ہے۔ آج کل اہلِ علم اس تاویل کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اور قرآن مجید کے اس قصّہ کے لیے وہ اور مصداق تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کو اس عورت کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں یہ مسئلہ بطور ایک مثال کے ہے۔ اس لیے نئے محققین پر گراں نہیں گزر سکتا +

(۳) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ کہ حضرت سیدنا ابوبکرؓ پہنچے وہ بھی رسول اللہ صلعم کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر حضرت عمرؓ پہنچے۔ وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔ وہ کنواں چھوٹا تھا۔ اس واسطے اس سے زیادہ آدمی وہاں بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ پہنچے۔ وہ تینوں سے علیحدہ تھوڑے فاصلے پر بیٹھے۔ سعید ابن المسیب نے (جو مدینہ کے تابعین لوگوں میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں) اس واقعے کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما اکٹھے مدفون ہو گئے۔ اور حضرت عثمانؓ ان سے علیحدہ بقیع میں دفن ہوئے۔ مصنفؒ کی رائے میں سعید ابن مسیب جیسے امام کا اس کی اس طرح تاویل کرنا ہمارے مدعا کے لئے بہترین شہادت ہے۔ حشر کے روز کے اکثر واقعات اسی طرز کے ہوں گے۔

اکثر لوگوں کے قوتِ ناطقہ کا تعلق اُن کے روح حیوانی سے بہت پختہ اور گہرا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں (عالم مثال کے متعلق) اونچے درجے کے علوم کے سمجھنے میں اُن کی یہی کیفیت ہوتی ہے جو مادرزاد اندھے کی مختلف قسم کی زنگدار روشنی کے متعلق ہو سکتی ہے وہ رنگ اور روشنی کی کیفیت اپنے تخیل میں لا ہی نہیں سکتا۔ البتہ ممکن ہے کہ لاکھوں سال میں مختلف صورتوں اور مثالوں (کو سمجھ لینے)

کے بعد اس کی کیفیت اُس کے ذہن میں آ سکے ۔

[اگر انسان کے نفسِ ناطقہ (روحِ الٰہی) کو نسمہ (روحِ حیوانی) کی رفتار سے چلنا پڑے، اور جب نفسِ ناطقہ کے نسمے سے گہرا اور پختہ تعلق ہے تو اسے مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑتا ہے، تو وہ عالمِ مثال کے واقعات و حادثات کو جلد نہیں سمجھ سکے گا۔ چونکہ عام لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ کہ اُن کا نفسِ ناطقہ رُوحِ حیوانی یا نسمے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اُونچے درجے کے علوم یعنی عالمِ مثال کے واقعات و حادثات کو جلد نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ اگر نفسِ ناطقہ نسمے یا رُوحِ حیوانی سے الگ ہو جاتے جیسے مرنے کے بعد کی زندگی میں ایک منزل میں پیش آئیگا۔ یا نفسِ ناطقہ کا رُوحِ حیوانی سے تعلق تو ہو مگر گہرا نہ ہو۔ تو یہ کیفیت اس دُنیاوی زندگی ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ عالمِ مثال کے واقعات و حالات کو اچھی طرح اور بہت جلد سمجھ سکتا ہے ۔

یہاں پر نابینا حافظ جی کی کھیر کی مثال ذکر کرنے سے مسئلہ واضح ہو جائیگا ۔

ایک نابینا حافظ جی کی اس کے دوست سے ملاقات ہوئی نابینا نے اپنے دوست سے پوچھا کہ کیا کھایا؟ دوست کا معمولی جواب تھا "کھیر" نابینا نے پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے؟ اس نے کہا۔

"سفید" نابینا نے کہا سفید کیسا ہوتا ہے؟ دوست نے جواب دیا۔ جیسے "بگلا" اور پھر اس نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے؟ دوست نے ہاتھ کو چونچ کی شکل بنا کر کہا۔ کہ بگلا یوں ہوتا ہے۔ حافظ جی نے اس کے ہاتھ کو ٹٹول کر کہا کہ یہ ٹیڑھی کھیر ان کے حلق سے کیسے اُترتی ہوگی؟

انسان کو لکھنا پڑھنا شروع کئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر اندھوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا سامان کتنی دیر کے بعد پھر میسّر آیا۔ اب اگر اس میں ترقی جاری رہتی ہے۔ تو ایک لمبے زمانے کے بعد ممکن ہے کہ وہ ایک دن روشنی کو بھی سمجھنے لگ جائیں۔

اسی طرح جن لوگوں میں روحِ حیوانی کے غلبے کی وجہ سے نفسِ ناطقہ کی انکشافی طاقت بہت تھوڑی ہے۔ اُنہیں مرنے کے بعد کی زندگی میں دو تین مختلف قسم کے تجربوں میں گزرنا پڑیگا۔ تو کہیں جا کر اُنہیں وہ بصیرت حاصل ہوگی۔ جس کے ذریعے سے وہ عالمِ مثال کے علوم سمجھ سکیں۔ اس کے بعد ان کی آتما کا یہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوگا]۔

بصیرت پیدا کرنے کی چند صورتیں

[جن لوگوں کی انکشافی قوت نہیں ہے ان میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے محشر میں جو تجربے استعمال ہونگے ان کی چند مثالیں دی جاتی ہیں]۔

(۱) محشر میں جب پہلے پہل لوگ کھڑے ہونگے اُن سے کہا جائیگا کہ حساب دو تو بعض لوگوں کا حساب بہت آسان ہوگا۔ اور بعض لوگوں کا بہت مشکل [اس سختی سے حساب دینے میں اُن کی روحانی قوّت پر چوٹ پڑے گی۔ اور پردے کچھ کم ہونگے۔ دُنیا میں جن انسانوں کو درشت خُو حاکموں سے پالا پڑا ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان اپنی ہستی وہاں کیسے گم کر بیٹھتا ہے۔ ان لوگوں کا اپنی ہستی سے ذرا غفلت برتنا ہی ان کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ ان کے دماغ پر بہیمیت غالب آچکی ہے۔ اب اُس پر جس قدر سختی ہوگی۔ اتنا ہی اس سے بُعد ہونے لگے گا۔ اور یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔ کہ جب بہیمیت سے بُعد ہوتا ہے۔ تو یہ اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی اپنی ہستی کو پہچاننے لگتا ہے۔ اور ترقی کرسکتا ہے یہ سخت حساب انتقامی کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے مرض کا ایک علاج اور اخلاقی کیفیت ہے]

(۲) [محشر میں دوسری چیز جس سے انہیں واسطہ پڑے گا] جہنم پر پل کی طرح کا راستہ ہے جس پر سے انہیں گزرنا پڑے گا بعض تو بالکل سالم گزر جائیں گے۔ اور بعض ایسے ہونگے کہ کانٹے اور دوسری روکنے والی چیزیں ان کے بدن پر خارش پیدا کر دینگی۔ مگر وہ اس سے پار نکل سکیں گے۔ [یہ تجربہ اُن کی ہمت کو زندہ کرنے والا ہے جب نیچے دوزخ صاف نظر آ رہی ہے۔ اگر وہ زور دے کر احتیاط سے نہ گزریں تو اُن کے لئے یقینی موت ہے۔ اس طرح ان کی تمام

قوتِ ارادی ایک نقطے پر جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی اُن کے اندر روشنی پیدا ہونے کا ایک ذریعہ بنتی ہے]

(۳) حکم ہوگا کہ انسان اس کے پیچھے جائے جسے اس نے دُنیا میں اپنا امام بنا رکھا تھا۔ اس میں بعض آدمی نجات پا جائینگے۔ اور بعض ہلاک ہو جائینگے [وہاں ہر شخص کے امام متبوع (یعنی وہ امام جس کے پیچھے انسان چلتا ہے) کی ایک صورت ظاہر ہو گی اور اُنہیں حکم دیا جائیگا۔ کہ تم جس طرح دُنیا میں اس کے پیچھے چلتے تھے۔ اب پھر اس کے پیچھے جاؤ۔ وہ شوق سے اس کے پیچھے چلنے لگیں گے۔ اس رفتار اور ریاضت سے ان کی جو کمی اور حجاب تھا۔ وہ دُور ہو جائیگا۔ اور اُن کو وہ چیز نظر آنے لگ جائیگی تو ان کی نجات ہو جائیگی۔ یعنی ان کا حشر کا جھگڑا ختم ہو جائیگا۔ بعض اماموں کے پیچھے لگ کر تباہ ہو جائیں گے]

(۴) ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے [ان کو سمجھ آنے لگے گی کہ یہ کام جو ہم نے کیا تھا۔ اس کا نتیجہ ہے۔ تو اس طرح اپنے بدن سے تمام اعضاء کے فعل اُنہیں یاد آئینگے۔ اور اُن کے نتائج اُنہیں اکٹھے نظر آنے لگیں گے۔ اس سے اُن کی بصیرت روشن ہو جائیگی]

(۵) اُنہیں پڑھنے کے لیے اپنے عملی چٹھے دیئے جائیں گے۔

[یہ بھی کرم اور اس کے پھل کا ایک تصوّر ہے۔ جو ان کے دماغ پر

ایک خاص اثر ڈالے گا۔ ہاتھ پاؤں کے بولنے کی جو صورت ہے۔ وہ
زیادہ تر ان پڑھ لوگوں کے کام آئے گی۔ اور اعمال نامہ پڑھے لکھے
لوگوں کو زیادہ مؤثر کرے گا] +

(۶) جس چیز سے اس نے بخل کیا ہے اُسے اُس کو گردن پر
اُٹھانا پڑے گا۔ اس سے اُسے داغ دیا جائے گا [اس سے در حقیقت
بخیل انسانوں کو اُن کے اعمال کے نتائج پر متنبّہ کرنا منظور ہے]

خلاصہ یہ کہ یہ سب اُس چیز کی صورتیں اور شکلیں ہیں جو انسانی
رُوح میں اعمال کی رُوح محفوظ تھی۔ ان صورتوں کا خاص شکل میں ظاہر
ہونا اُس کے مطابق ہے۔ جو صورتِ نوعیّہ کے احکام اس کے لئے
معین کرتے ہیں۔[ایک انسان دُنیا میں بُرا کام کرتا ہے۔ جیسے اس
کے پاس کافی سے زیادہ کھانا موجود ہے۔ اور ایک بھوکا مسکین اُس
کے روبرو دم توڑ رہا ہے۔ اور یہ بخیل اس بھوکے کو روٹی نہیں دیتا۔ اس
فعل کا جو اثر اُس مسکین کے دل پر ہوگا۔ اُسے صورتِ نوعیہ انسانی محفوظ
رکھتی ہے۔ وُہی چیز اُسے دیدی جائے گی۔ اس سے اس کے دماغ
میں ایک تنبّہ پیدا ہونا شروع ہوگا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ
حشر میں تکلیفیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ انتقامی عذاب ہے۔ اس کی
مثال ایسی ہے جس طرح دُنیا میں بادشاہ اپنے مخالفین کو تکلیف دیتے
ہیں۔ واعظ لوگ انہی مثالوں سے ان احکام کو عام انسانیّت کے

ذہن نشین کرتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت سے بہت دُور ہیں۔ یہ تمام تکلیفیں صرف اسی وجہ سے ہو رہی ہیں کہ مجرم کی طبیعت کی ترقی اور اصلاح کی جائے اور اس کی تکلیف اور عذاب کی شکل بھی وہی ہے۔ جو اس کے فعل نے انسانوں میں پیدا کی تھی] ہر وہ انسان جس کا نفس ناطقہ بڑا قوی ہے اور اس کی رُوحِ ہوائی بہت فراخ ہے حشر کی تمثیلیں اس کے حق میں پوری پوری اور زیادہ ہونگی۔ [یعنی جس قدر حجاب بڑے ہونگے اُن کے زائل کرنے کے لئے بھی زیادہ کوشش کی ضرورت ہوگی] اس لئے رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ اِنّ اکثرعذاب اُمتی فی قبورھم (یعنی میری اُمت کا عذاب اکثر قبروں میں ختم ہو جائے گا) [یعنی یہ امت پہلی اُمتوں کی بہ نسبت کمزور ہے۔ اس کے لئے حشر کی تصویریں زیادہ نہیں بنیں گی۔ تھوڑی سی بات سے یہ جلدی سمجھ جائینگے]

حشر کے بعض مظاہر حشر میں بعض ایسی مثالیں (مثالی چیزیں) بھی ظاہر ہونگی جن کے مشاہدے کے لئے تمام رُوحیں ایک درجے پر ہونگی۔ مثلاً رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نبی ہونے کے بعد جو ہدایت آپ کے ذریعہ دُنیا میں پھیلی وہ ایک حوض کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ [یعنی لوگوں کو دُنیا میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے جتنا فیض پہنچا۔ وہ یہاں پانی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور آپ کے فیض یافتہ

لوگوں کو اِس حوض سے پانی ملے گا۔ یہی حوض کوثر ہے۔ جو قرآن مجید کی تعلیم سے فائدہ حاصل کرنے کو ظاہر کرتا ہے] اور انسان کے جس قدر اعمال محفوظ ہیں۔ وہ ترازو میں سب کے لئے یکساں تولے جائینگے۔ اور [پہلے درجہ میں] انعام اچھے کھانے، اچھے پینے، نہایت خوبصورت عورتوں، عمدہ لباس اور اچھے گھروں کی شکل میں نمایاں ہوگا ◆

نوعی اور شخصی خواہشیں | انسانی نفس کی ظلمانی حالتوں سے نعمت تک پہنچنے میں بہت سے عجیب درجے ہیں۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کے بارے میں بیان فرمائے۔ جو دوزخ میں سے سب سے آخر میں نکل کر جنّت میں داخل ہوگا۔ [یہ لمبی حدیث ہے انسانی رُوحوں کی ایک قسم کی خواہشیں ایسی ہیں۔ جس میں تمام نوعِ انسانی متفق ہے۔ ایسی شکل میں انعام معیّن ہوگا۔ اس کے بعد بعض خواہشیں ایسی بھی ہیں۔ کہ وہ بعض انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور دُوسروں میں نہیں پائی جاتیں [یعنی اِن کا بھی لحاظ رکھا جائیگا] یہی اُس حدیث کا مطلب ہے۔ جس میں رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ مَیں بہشت میں گیا۔ ایک گندم گوں سُرخ ہونٹ والی لڑکی دیکھی۔ مَیں نے پوچھا۔ جبرائیل ع! یہ کیا ہے، [یعنی عربی مذاق میں یہ خوبصورتی کا نمونہ نہیں ہے۔ مگر حبش کے لوگ اس قسم کی عورتوں کو پسند کرتے ہیں] اُس نے کہا اللہ تعالےٰ

نے یہ جعفرؓ کے لئے پیدا کی ہے۔ [حضرت جعفرؓ پہلی ہجرت میں حبشہ میں کافی زمانہ تک رہ کر آئے تھے] اور رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جعفرؓ بن ابی طالب سے فرمایا۔ کہ جب اللہ تعالیٰ تجھے جنّت میں داخل کرے گا۔ اگر تو چاہے، کہ گھوڑے پر سوار ہو۔ تو سُرخ یاقوت کا ایک گھوڑا ہوگا۔ جو جہاں تیرا جی چاہیگا تجھے اُڑاتا پھرے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے۔ کہ " ایک جنّتی جنّت میں کھیتی کرنے کی اجازت مانگے گا۔ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے۔ کہ کیا بونے کے بغیر تجھے سب کچھ نہیں مل رہا؟ وہ کہے گا۔ کہ ہاں مل تو سب کچھ رہا ہے۔ مگر میں خود کاشت کرکے دیکھنا چاہتا ہوں۔ " تو یہ ایک طرف بیج ڈالے گا۔ اور دوسری طرف کھیتی تیار ہو جاتے گی۔ اور پھر وہ خود ہی کٹ جائیگی۔ اُس کے غلّہ کے ڈھیر چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کی مانند لگ جائیں گے۔ تو اُسے اللہ تعالےٰ کہے گا۔ اے آدم کے بیٹے! لے تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا۔ [یہ نمونہ ہے ان خاص خواہشوں کا جو اگلی زندگی میں پوری کی جائیں گی] اس کے بعد آخر میں اللہ تعالےٰ جل شانہٗ کا دیدار اور اُس کی تجلّیات کا ظہور ہوگا اور یہ دیدار ایسی جنّت میں ہوگا۔ جہاں مشک کے ڈھیر لگے ہوں گے ۔

اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے۔ اُس کے بیان سے ہم یہاں خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا ذکر نہیں کرتے اس میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا فخر سمجھتے ہیں [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اپنی عام تعلیم میں نہیں بتلایا] ✦